بیرنگ لفافہ
اور دوسرے افسانے
کشوری لال

"...فیروزہ جانتی تھی اگر اُس نے ٹال مٹول کی تو ہاشمی پھر پیسوں کی بات کرے گا۔ اُس نے سلیم کو باہر منشی کے پاس بھیج دیا۔ برقعہ اُتار کر چولی کے بٹن کھول دیے۔ جب ہاشمی نے ہاتھ لگا کر ٹٹولنا چاہا وہ کہنے لگی "آپ مزے بھی لیں گے اور ساتھ میں فیس بھی۔"

ہاشمی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کون کم بخت پیسوں کی بات کر رہا ہے۔"

(افسانہ "وکیل کی فیس" سے)

بیرنگ لفافہ اور دوسرے افسانے

کشوری لال

MODERN PUBLISHING HOUSE
9, Gola Market, Darya Ganj, New Delhi-110002
Phone: 011-23278869

Bearing Lifafa Aur Doosre Afsane (Short Stories) **2009**
by : **Kishori Lal** **Rs. 150/-**

بیرنگ لفافہ

اور

دوسرے افسانے

کشوری لال

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

Q-1/23، گراؤنڈ فلور، ڈی ایل ایف سٹی فیس-II
گڑگاؤں-122002 (ہریانہ)
فون: 0124-4101972

سنِ اشاعت : ۲۰۰۹ء
قیمت : ایک سَو پچاس روپے
کمپوزنگ : نعمت کمپوزنگ ہاؤس، دہلی
سرورق : انعم آرٹس، دہلی
مطبع : ایچ۔ایس۔آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی-2

ISBN 978-81-8042-132-7-

زیرِ اہتمام
پریم گوپال متّل

ناشر:
موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹-گولا مارکیٹ، دریاگنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

انتساب

اُن دوستوں اور ہم جماعتوں کے نام
جن سے تقسیمِ ہند کے بعد ملاقات نہیں ہو سکی

فہرست

بیرنگ لفافہ

رات کو آٹھ بجے کھانا کھا کر جاوید اپنی زوجہ زرینہ بی سے یہ کہہ کر گھر سے باہر گیا کہ میں آدھا گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔ کھانے کے بعد اُسے پان کھانے کی عادت تھی۔ وہ اکثر باہر چلا جاتا تھا اور نو دس بجے تک گھر لوٹتا تھا۔ کبھی کبھی گلی میں یاروں دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے بیٹھ جاتا۔ کیونکہ یہ اُس کا معمول تھا اس لیے زرینہ نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ سُنی اَن سنی کر دی۔ وہ اُس کا انتظار کیے بغیر اپنے لڑکے چراغ اور لڑکی زینت کو ساتھ لے کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ جاوید کے ابّو اور امّاں بھی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ جب رات کوئی بارہ بجے زرینہ نے کروٹ بدلی تو اُسے محسوس ہوا کی آدھا بستر خالی تھا۔ اُس نے ہاتھ لگا کر دیکھا، جاوید نہیں تھا۔ اُس نے سوچا پیشاب کرنے گیا ہوگا۔ اس کی پھر آنکھ لگ گئی۔ ایک گھنٹے بعد جب دوبارہ آنکھ کھلی تو اُسے لگا کہ جاوید ابھی بھی بستر میں نہیں ہے۔ اُس نے ٹارچ جلا کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر جاوید دِکھائی نہیں دیا۔ پہلے کبھی وہ اتنی دیر سے نہیں آیا تھا۔ اُسے تشویش ہوئی۔ اُس نے جا کر ابّو اور امّاں کو جگایا۔ ابو اُٹھ کر گھر کے باہر گئے۔ گلی میں سنّاٹا تھا۔ بجلی گُل ہو جانے کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ چوکیدار کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اتنی رات گئے وہ کہاں جاتا۔ یہی فیصلہ ہوا کہ اگر صبح آفتاب طلوع ہونے تک وہ نہیں آیا تو اُس کا پتہ لگایا جائے گا۔ وہ جا کر سو گیا مگر فکر سے اُسے نیند نہیں آئی۔ زرینہ بھی بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی اور خدا سے جاوید کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔ جاوید کا ابو کفیل

محمد بار بار یہی کہتا۔ ”خدا خیر کرے۔“

صبح چھ بجے تک جب جاوید نہیں آیا اور نہ ہی اُس کی خیر عافیت کی کہیں سے کوئی خبر آئی تو گھر والوں کو تشویش ہوئی۔ کفیل محمد سب سے پہلے پان والے کی دُکان پر گیا۔ دُکان بند تھی۔ مگر پان والے کا گھر دُکان کے پیچھے تھا۔ اُس نے جا کر پوچھا تو پان والے نے کہا: ”کل رات جاوید آیا تھا۔ مجھے پان لگانے کے لیے کہا۔ میں پان لگا ہی رہا تھا کہ کسی شخص نے اُسے دُور سے آواز لگائی۔ وہ مجھے یہ کہہ کر گیا تھا ابھی آتا ہوں لیکن وہ نہیں آیا۔ میں نے یہی سمجھا کسی ضروری کام سے چلا گیا ہوگا۔“

اِدھر اُدھر پوچھ تاچھ کرنے سے جب کوئی سراغ نہیں ملا تو کفیل محمد نے ترکمان گیٹ تھانے پر رپورٹ درج کروائی۔ پولیس تفتیش کرتی رہی مگر اُسے پوری کامیاب نہیں ملی۔ کئی دن تک گھر میں ماتم چھایا رہا۔ چراغ اور زیب چلاّ چلاّ کر بار بار پوچھتے: ”ابو کہاں ہیں؟“ کوئی اُنھیں کیا بتائے۔ رو رو کر زرینہ کی آنکھیں سوج گئیں۔ جوں جوں وقت آگے نکلتا گیا اُن کی اُمیدیں پیچھے ہٹتی گئیں۔ جب دو مہینے تک کوئی پتہ نہیں چلا تو وہ سر مار کر چُپ ہوگئی اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا۔

کفیل محمد کی لاہوری گیٹ پر رنگ بیچنے کی دُکان تھی۔ جاوید بھی اپنے ابّو کے ساتھ کام کرتا تھا۔ صبح دس بجے دُکان کھلتی تھی۔ شام کو سات بجے دُکان بند کر کے باپ بیٹے سیدھے گھر آتے تھے۔ ہاتھ کھُلا ہونے کی وجہ سے اچھا کھانا پینا تھا۔ تعلیم کے لیے چراغ اور زیب دریا گنج سینٹ میری اسکول جاتے تھے۔ چراغ چوتھی جماعت کا طالبِ علم تھا۔ زیب ابھی دوسری جماعت میں تھی۔ جہاں تک کفیل محمد جانتا تھا جاوید کو کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ نہ وہ شراب پیتا تھا نہ سگریٹ۔ البتہ دن میں آٹھ دس زردہ والے پان ضرور کھاتا تھا۔ اُس کی صحت اچھی تھی۔ اُس کے سبھی یار دوست شریف گھرانوں کے تھے۔ کبھی کبھی دُکان سے اٹھ کر وہ لاہوری گیٹ کی مسجد میں چلا جاتا تھا جہاں گھنٹہ آدھ گھنٹہ لگا کر دُکان پر لوٹ آتا تھا۔ وہ وہاں کیوں جاتا تھا کفیل محمد نے کبھی غور نہیں کیا۔ غور کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ مسجد جانا تو

نیک کام تھا۔ ابو نے یہی سوچا کہ شاید جاوید کو روحانیت میں دلچسپی تھی۔ ایک دن کفیل محمد کو خیال آیا کہ مسجد میں جا کر جاوید کو پوچھا جائے مگر اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ مسجد کے امام نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتا۔ اتنے لوگ آتے جاتے ہیں ہر ایک پر نظر نہیں رکھتا۔''

اُس حادثے کو ایک سال گزر گیا۔ کفیل محمد اپنے لڑکے کے بارے میں پوچھ پوچھ کر ہار گیا۔ بچے ابو ابو کہہ کہہ کر ہار گئے۔ جاوید کی ماں دعائیں مانگ مانگ کر ہار گئی اور زرینہ آنسو بہا بہا کر ہار گئی۔ ایک دن ڈاکیہ نے کفیل محمد کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اُس وقت وہ دُکان پر گیا ہوا تھا۔ جاوید کی ماں پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ بچے اسکول میں تھے۔ زرینہ گھر پر اکیلی تھی۔ اس نے باہر آ کر پوچھا: ''کیا بات ہے؟''

''بیرنگ لفافہ ہے۔ دو روپے لگیں گے۔''

''کس نے بھیجا ہے؟''

ڈاکیہ نے دیکھ کر کہا: ''بھیجنے والے کا نام پتہ نہیں لکھا ہے۔''

''کس کے نام ہے؟''

''زرینہ بی معرفت محترم کفیل محمد۔''

''زرینہ تو میرا نام ہے۔''

''تو دو روپے دے دو اور چٹھی لے لو۔''

زرینہ سوچ میں پڑ گئی۔ ڈاکیہ نے کہا: ''نہ لینا چاہو تو ضروری نہیں۔ واپس لے جاؤں گا۔''

زرینہ نے جیب سے دو روپے نکال کر ڈاکیہ کو دِیے اور لفافہ لے لیا۔ سردی کا موسم تھا۔ صحن میں دُھوپ تھی۔ وہ کمرے سے کُرسی لے آئی اور بیٹھ کر لفافے کو کھولا۔ اندر سے چٹھی نکالی۔ تحریر کو دیکھتے ہی وہ جھٹ پہچان گئی۔ خط جاوید نے بھیجا تھا۔ پڑھنے سے پہلے اُس نے اللہ کا نام لیا اور خط کو آنکھوں سے لگا کر چوما۔ پھر پڑھنے لگی:

''میری رفیقِ حیات، جانِ من زرینہ!

تسلیم بجا لاتا ہوں۔ میں تم سے معافی کا خواستگار ہوں۔ اتنے عرصے تک تم سے رابطہ

قائم نہیں کر سکا۔ حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد یقین ہے کہ تم مجھے معاف کر دوگی۔

میں لکھنا تو تفصیل سے چاہتا تھا مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ مختصر ہی لکھوں گا۔ موقع ملنے پر تمھیں تفصیل سے لکھوں گا۔ اُمید ہے تم میری مجبوری کو سمجھ سکوگی۔

تم نے اخباروں میں لشکرِ رسول کا نام پڑھا ہوگا۔ یہ وہ اسلامی جماعت ہے، جو دُنیا کے مسلمانوں پر ہونے والے غیر مسلموں کے روزمرّہ ظلم و تشدّد کے خلاف لڑ رہی ہے۔ اس جماعت کا سرکردہ مولانا سعید امام بخش انصاری ہے۔ ایک نہایت ہی نیک پاک دامن شخصیت ہے۔ اُسے خدا تعالیٰ کی طرف سے فرمان واجب الاذعان ہوا ہے کہ دُنیا کے غیر مسلموں کو نیست و نابود کر دو، اُنھیں اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرو۔ ایک دن مجھے اور میرے کچھ ساتھیوں کو بلا کر اُس نے کہا 'ان غیر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے وحشیانہ افعال کو روکنا اور ختم کرنا مقدّس کام ہے جو میں تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ سب مسلمانوں کو ایک جھنڈے کے نیچے لے آؤ اور جلد سے جلد کافروں کو موت کے گھاٹ اُتار کر دنیا میں امن قائم کرو'۔ اس نیک کام کو انجام تک پہنچانے کے لیے میں اس جماعت کا ایک اہم کارُکن ہوں۔

دو دن میں اس جماعت کی ایک ٹکڑی، جس میں میں بھی شامل ہوں، ایک خاص مہم پر جا رہی ہے۔ وہ مہم کیا ہے اور ہم کہاں جا رہے ہیں یہ میں تمھیں نہیں بتا سکتا۔ جب ہم کامیاب ہو کر لوٹیں گے، تمھیں آ کر ملوں گا اور سب کچھ کھول کر بتاؤں گا۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہوگی۔ اگر لڑتے لڑتے میں شہید ہو گیا تو میرے لیے جنّت کے دروازے کھول دِیے جائیں گے۔ خدا تعالیٰ تم سب کو برکت دے اور کافروں کی بربریت سے محفوظ رکھے۔ ابّو اور امّاں کو میرا خلوص بھرا سلام کہنا۔ چراغ اور زیب کو میرا پیار دینا۔ تم سب مجھے بہت یاد آتے ہو، لیکن جو مرضی اللہ تعالیٰ کی ہے اُس کا احترام کرنا اور اُسے انجام تک لے جانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔

تمھارا

شفیق جاوید"

خط پڑھنے سے پہلے زرینہ کی جو سوئی ہوئی اُمیدیں جاگ اُٹھی تھیں، خط پڑھنے کے بعد اُن سب پر پانی پھر گیا۔ اُسے ایسا لگا جیسے کسی نے اُس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ اُس نے خط کو دوبارہ پڑھا، شاید پڑھنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو۔ زرینہ کے سامنے اب سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس خط کا ذکر ابّو اور امّاں سے کرے یا نہ کرے۔ جاوید کے اچانک غائب ہو جانے کے بعد ابّو دل کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اُسے ڈر تھا کہیں خط پڑھ کر اُن کی حرکتِ قلب بند نہ ہو جائے۔ مگر اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کس سے مشورہ کرے۔ اس سوچ میں کئی دن گزر گئے۔ ایک دن اُس نے کاغذ اُٹھایا اور جاوید کو خط لکھنے بیٹھ گئی:

"جاوید میاں!

میں نے تمھیں پہلے کبھی خط نہیں لکھا۔ اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ القاب میں کیا لکھوں، مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر میں جاوید میاں ہی لکھنا مناسب سمجھا۔

تمھارا خط ملا۔ پڑھ کر افسوس بھی ہوا اور حیرت بھی۔ تم ہمیں بغیر بتائے چھوڑ کر چلے گئے جس کے لیے تم مجھے معاف کرنے کے لیے کہتے ہو۔ ایسا لگتا ہے تمھاری نظر میں یہ ایک چھوٹی سی بھول تھی۔ میری نظر میں یہ نہ صرف جرم تھا بلکہ گناہ بھی۔ تم جسے نیک کام سمجھ کر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہو، میری نظر میں وہ کام تمھاری گمراہی کا ثبوت ہے۔ تمھاری جماعت کے سرکردہ کا یہ دعویٰ کہ دُنیا کے سبھی غیر مسلم اسلام کے دشمن ہیں بے بنیاد اور شرمناک ہے۔ میں اس موضوع پر کوئی تنقید نہیں کرنا چاہتی۔ صرف تمھاری توجہ ایک پرانے واقعے کی طرف دلوانا چاہتی ہوں۔ آج سے تقریباً دس سال پہلے جب ہمارے نکاح کو دو مہینے ہی ہوئے تھے، تمھارے ابّو کی دُکان کو آگ لگ گئی تھی۔ دُکان کا سارا مال جل گیا تھا۔ مال کا بیمہ نہ ہونے کی وجہ سے ایک کوڑی بھی وصول نہیں ہوئی تھی۔ تب تمھارے ابّو اور امّاں نے امداد کے لیے کئی رشتہ داروں کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ سب کے ہاں سے اپنا سا منہ لے کر واپس آئے تھے۔ پھر تمھارے ابّو تمھاری ماں۔ میرے گہنے لے کر لالہ گنیشی لال کے پاس قرض لینے کی نیت سے گئے تھے۔ بھلا ہو اُس شخص کا اُس نے جھٹ دس ہزار روپے بغیر کسی تحریر کے قرض پر دے دِیے اور گہنے گروی رکھنے سے انکار کر دیا۔ تمھیں شاید یاد ہوگا اُس نے

ابّو سے کہا تھا: 'کفیل محمد میں تمھیں کئی سالوں سے جانتا ہوں۔ تم نیک آدمی ہو۔ سچّے مسلمان ہو۔ مجھے یقین ہے تمھارے پاس پیسے آتے ہی تم میرا قرض سود کے ساتھ ادا کردو گے۔ جاؤ اللہ کا نام لے کر پھر سے اپنا کاروبار شروع کرو'۔ دو سال کے بعد جب تمھارے ابّو قرض سود کے ساتھ لوٹانے گئے تو اُس نے سود نہیں لیا۔ اُس نے کہا: 'میں سود لیتا ہوں مگر تم سے نہیں لوں گا۔ میں تمھاری مجبوری کا ناجائز فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا'۔ تمھارے سرکردہ کا یہ سوچنا کہ ساری دُنیا پر مسلمانوں کی حکومت ہوجائے گی وہ بھی بے بنیاد ہے۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ایک منٹ کے لیے مان لو ایسا ہو بھی گیا تو تمھارا کیا خیال ہے، مسلمان ایک دوسرے کا گلا کاٹنا چھوڑ دیں گے؟ کیا امیر مسلمان اپنی پونجی غریب مسلمانوں میں بانٹ دیں گے؟ کیا مسلمان حکمراں رشوت لینا بند کردیں گے؟ کیا چور بازاری، غنڈہ گردی، زنا بالجبر، دھوکا دھڑی ختم ہوجائیں گے؟ میاں سوچو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔

تم کہتے ہو اگر تم مارے گئے تو شہید ہوجاؤں گا۔ تمھارے لیے جنّت کے دروازے کھل جائیں گے، جنّت میں حوریں تمھاری خدمتگار رہوں گی۔ تم تو وہاں کسی حور کو گود میں بٹھا کر مزے لوگے اور میں یہاں تمھیں یاد کر کے تڑپتی رہوں گی۔

تم اپنے آپ کو پاکباز سمجھتے ہو، مگر میں جانتی ہوں چچازاد بہن کے ساتھ تمھارے کیا تعلقات تھے۔ نسیم کی زوجہ کے ساتھ تو ابھی بھی تمھارے ناجائز تعلقات ہیں۔ تم آدمی ہو۔ تم مجھے کبھی بھی طلاق دے سکتے ہو۔ مگر میں نہیں دے سکتی۔ کاش میں بھی ایسا کرسکتی۔ آخر میں میں تم سے ایک سوال کرنا چاہوں گی۔ میں نے بھی قرآن شریف پڑھا ہے، کہاں لکھا ہے کہ بے گناہ لوگوں کو، جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں، مذہب کے جنون میں آکر تم انھیں موت کے گھاٹ اُتار دو۔

خدا تمھیں سوچنے کی قوت دے اور راہِ راست دکھائے۔

تمھاری بدنصیب

زرینہ"

زرینہ نے خط کو بند کر کے لفافے میں ڈالا۔ مگر اُس کے پاس جاوید کا پتہ نہیں تھا۔ اُس نے جاوید کا خط اُٹھا کر دیکھا۔ اُس پر نہ کوئی تاریخ تھی نہ ہی پتہ۔

تین مہینے کے بعد ایک بار ڈاکیہ پھر سے ایک بیرنگ لفافہ لے آیا۔ دو روپے لے کر زرینہ نے خط لے لیا۔ کھول کر خط کو دیکھا۔ تحریر سے وہ خط کسی اجنبی کا لگتا تھا۔ پہلے خط کی طرح اُس پر نہ کوئی تاریخ تھی اور نہ ہی بھیجنے والے کا پتہ۔ صرف دو سطریں تھیں:

''مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تمھارا شوہر شفیق جاوید اپنی قوم کی عصمت کو برقرار رکھنے کے لیے دُشمنوں کے ساتھ لڑائی کرتے ہوئے شہید ہو گیا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے اور تمھیں حوصلہ بخشے۔''

جب زرینہ نے وہ خط ابّو کو دکھایا تو اُسے پڑھتے ہی اُن پر دل کا دورہ پڑا اور وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ڈھیر ہو گئے۔ ابّو کی وفات کے چار مہینے بعد جاوید کی اماں بھی چل بسی۔ بچّے ابھی چھوٹے تھے۔ زرینہ اکیلی پڑ گئی۔ وہ جاوید سے طلاق لے کر پھر سے نکاح کرنا چاہتی تھی مگر خط پر تاریخ اور پتہ نہ ہونے کی وجہ سے عدالت نے اُسے جاوید کی موت کا ثبوت نہیں مانا۔ دُکان بند ہونے کی وجہ سے آمدنی کا ذریعہ بھی جاتا رہا۔ وہ لالہ گنیشی لال کے پاس گئی۔ مگر جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اس دُنیا میں نہیں رہا تھا وہ غم کے آنسو پی کر رہ گئی۔

آگے کیا ہوا یہ اس کہانی کا موضوع نہیں ہے۔ اُس کی اپنی ہی الگ کہانی ہے۔

OO

جہنّم کا ایڈریس

دہلی کے چاوڑی بازار میں پدم چند رُوپ چند کے نام سے تھوک کاغذ کی فرم مشہور تھی۔ دونوں بھائی تھے اور برابر کے حصّے دار۔ ۱۹۴۰ء میں انھوں نے مل کر یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ آہستہ آہستہ کام بڑھتا گیا۔ اُن کے پاس ہندوستان میں کاغذ بنانے والے کئی کارخانوں کی ایجنسی تھی۔ کچھ دوسرے ملکوں سے کاغذ درآمد کرنے کے لائسنس بھی تھے۔ ۱۹۷۱ء میں بڑے بھائی پدم چند کی وفات ہوگئی۔ کیونکہ اس نے شادی نہیں کی تھی، رُوپ چند فرم کا واحد مالک بن گیا۔ اس کے تین لڑکے تھے اور ایک لڑکی، جس کی اُس نے اٹھارہ سال کی عمر میں شادی کردی تھی۔ تینوں لڑکے باپ کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے۔ تینوں کی شادی ہو چکی تھی۔

سب سے بڑے لڑکے گوپی ناتھ کی بیوی کا نام سیتا تھا۔ وہ کسی دُور کے رشتے دار کی لڑکی تھی۔ آٹھ جماعت تک پڑھی تھی۔ سیدھی سادی تھی۔ اُس کا سارا وقت تقریباً گھر کے کام کاج میں گزرتا تھا۔

دوسرے لڑکے پریم ناتھ کی بیوی سندھیا ایک امیر خاندان سے آئی تھی۔ اُس کا باپ کانپور میں فولاد کے ایک بہت بڑے کارخانے کا مالک تھا۔ رہنے کے لیے بہت بڑی کوٹھی تھی۔ سندھیا بی۔اے پاس تھی، مگر پریم ناتھ نے ایک سال کے بعد کالج کی پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ سندھیا کو گھر کے کام میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ نہ ہی اُسے کھانا بنانا آتا تھا۔ زیادہ وقت

وہ کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتی رہتی تھی یا ٹی.وی کے سامنے بیٹھ جاتی تھی۔

تیسرے لڑکے بھولا ناتھ کی بیوی نشی ایک معمولی خاندان سے آئی تھی۔ اُس کا باپ کسی زمانے میں پدم چند روپ چند کی فرم میں منشی تھا۔ نشی کبھی کبھی روپ چند کے گھر چلی جاتی اور کیونکہ بھولا ناتھ ہم عمر تھا اُس کے ساتھ کھیلتی تھی۔ آگے چل کر کھیل کھیل میں دونوں میں عشق ہو گیا۔ رُوپ چند اُن کی شادی کے حق میں نہیں تھا مگر بھولا ناتھ اور اُس کی ماں کے اصرار پر مان گیا۔ نشی اور بھولا ناتھ دونوں بی.اے پاس تھے۔

رُوپ چند کا گھر بازار سیتا رام کی ایک گلی میں تھا۔ گھر تو خاصہ کشادہ تھا مگر پُرانا تھا۔ سندھیا کو قطعی پسند نہیں تھا۔ شادی کے کچھ مہینے تک تو وہ چُپ رہی، پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنے سسر اور شوہر پر مکان بدلنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ وہ بار بار کہتی: ''یہ کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ میرا تو دَم گھُٹتا ہے۔'' جب اُس کا سسر ٹال مٹول کرتا تو وہ کہتی: ''بابو جی! آپ کے پاس اتنی دولت ہے۔ کیا کریں گے آپ اس کا، کسی کھلی جگہ میں رہیے۔ سب آرام سے زندگی بسر کریں گے۔ آپ کی صحت کے لیے بھی مفید رہے گا۔''

رُوپ چند نے جواب دیا: ''میں یہاں سے اپنی دُکان پر پیدل چلا جاتا ہوں۔ اتنی دُور سے کیسے آؤں گا؟''

سندھیا نے کہا: ''بابو جی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہم موٹر گاڑی خرید لیں گے۔ چلانے کے لیے ڈرائیور رکھ لیں گے۔ آپ کے پاس دولت کی کمی ہے کیا!''

آخر کار رُوپ چند مان گیا۔ اُس نے روہتک روڈ پر گیارہ سو گز زمین لے کر بہت بڑی کوٹھی بنوائی۔ اُس کی دیکھ بھال کے لیے کئی نوکر رکھ لیے۔ سندھیا کے کہنے پر ایک باورچی بھی رکھ لیا۔ موٹر گاڑی تو خیر انھوں نے خرید ہی لی اور ڈرائیور بھی رکھ لیا۔ بچّے ابھی چھوٹے تھے۔ جب وہ اسکول جانے لگے تو اُن کو اسکول چھوڑنے اور لانے کے لیے ایک اور گاڑی رکھ لی۔ اس گاڑی کا استعمال سندھیا بھی کرتی تھی۔ کیونکہ تینوں بہوؤں میں وہ سب سے زیادہ ہوشیار تھی، بازار سے گھر کا سامان لانا اُس کی ذمّے داری تھی۔ اُسے ویسے بھی گھر سے باہر

گھومنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ سیتارام بازار والے مکان کو روپ چند نے گودام میں بدل دیا۔ جیسے گودام کاغذ سے بھرے رہتے تھے ویسے رُوپ چند کی تجوریاں نوٹوں سے بھری رہتی تھیں۔

سندھیا نے اس عرصے میں آس پاس کی کچھ خواتین سے واقفیت پیدا کرلی۔ دو چار مہینے کے بعد دس خواتین نے مل کر اپنی ایک انجمن بنائی۔ مہینہ میں ایک بار باری باری سے سب کے گھر میں محفل ہوتی۔ جب وہ مجلس سندھیا کے گھر میں ہوتی وہ سیتا اور نشی کو اُن کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنے ساتھ شریک کرلیتی۔ مجلس دن کے بارہ بجے سے لے کر دوپہر تین چار بجے تک چلتی۔ لنچ بھی وہیں ہوتا۔ خوب گپ شپ۔ ہنسی مذاق اور بحث مباحثہ ہوتا۔ تفریح کے لیے اُنھوں نے تاش کھیلنا بھی شروع کردیا۔ کبھی رمی تو کبھی سویپ۔ سندھیا بہت خوش تھی۔ اُس کا کافی وقت آرام سے کٹ جاتا تھا۔ مجلس کے علاوہ ویسے ہی اپنی سہیلیوں کے ہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ زیادہ تر وہ اپنی ایک خاص سہیلی کرونا کے گھر جاتی تھی۔

کرونا کا شوہر برج نرائن اکثر دہلی سے باہر دورے پر رہتا تھا۔ کوئی بچّہ نہیں تھا۔ گھر میں کرونا اور اُس کی ساس تھی۔ کیونکہ کوئی روک ٹوک نہیں تھی اور نہ ہی کوئی خاص ذمّے داری، دونوں سہیلیاں کافی وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتی تھیں۔ پہلے تفریح کے لیے ٹی وی کے پروگرام تھے۔ پھر جب ویڈیو آ گیا تو وہ کسی نہ کسی فلم کی کیسٹ کرایے پر لے کر دیکھتی تھیں۔ ایک دن جب کرونا کیسٹ کرایے پر لینے کے لیے گئی، اُس نے دیکھا دُکان دار نے کسی گاہک کو ایک کیسٹ کاغذ میں لپیٹ کردی۔ اُس نے جب دُکان دار سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

دُکاندار نے جواب دیا: ''بہن جی! یہ آپ کے مطلب کی نہیں۔''

''ایسی کیا بات ہے؟ جو اور دیکھ سکتے ہیں وہ ہم کیوں نہیں دیکھ سکتے؟'' کرونا نے حیرانی سے پوچھا۔

''مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔ اگر آپ کو اچھی نہ لگے تو آپ مجھے بُرا بھلا مت کہیے گا۔''

کرونا کے کہنے پر دُکاندار نے کیسٹ کاغذ میں لپیٹ کر اُسے دے دی۔

کرونا نے گھر آ کر جب وہ کیسٹ لگائی تو دونوں سہیلیاں دنگ رہ گئیں۔ ننگے مرد اور ننگی عورتیں دن میں کھلم کھلا وہ کر رہی تھیں جو میاں بیوی رات کو بستر میں کرتے ہیں، بلکہ کئی حرکتیں تو اُن کو عجیب لگیں جن کے بارے میں اُنھیں کوئی علم نہیں تھا۔ پہلے تو اُنھوں نے سوچا اسے بند کر دیں مگر بند کرنے کو اُن کا دل نہیں کرتا تھا۔

سندھیا نے کہا: ''چلنے دو۔ دوکاندار تو کرایہ پورا لے گا چاہے ہم دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ کرایہ تو وصول کرنا ہی ہے۔''

کرونا نے مسکراتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔ اب انھیں فحش نظارے دیکھنے کا چسکا لگ گیا۔ وہ سوچنے لگیں کیا ہی مزہ آتا اگر وہ اُسی طرز یا انداز سے وہی کھیل اپنے شوہر کے ساتھ کھیل سکتیں جیسا کہ اُنھوں نے دیکھا تھا۔ مگر وہ جانتی تھیں یہ ممکن نہیں تھا۔ پہلے تو کوئی اپنے شوہر سے کیسے کہے اور اگر ہمّت کر کے کہہ بھی دے تو وہ کیا سوچے گا۔ کوئی بڑی بات نہیں اگر وہ اُن کی وفاداری پر شک کرنے لگ جائے یا پوچھ بیٹھے تم نے یہ ہُنر کہاں سے سیکھے۔

ایک دن دونوں ہم جولی سینما حال سے پکچر دیکھ کر باہر نکلیں تو ایک اجنبی نے کرونا کے سامنے آ کر کہا: ''آپ روہتک روڈ پر رہتی ہیں نا؟'' اگر وہ اجنبی جوان اور خوبصورت نہ ہوتا تو شاید بغیر اُسے کوئی جواب دِیے وہ منہ موڑ کر چلی جاتی۔ اُس نے اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ دیتے ہوئے جواب دیا: ''ہاں! مگر آپ کیسے جانتے ہیں؟''

اُس آدمی نے کہا: ''میرا نام رام موہن ہے۔ میں بھی روہتک روڈ پر رہتا ہوں آپ کے گھر کے سامنے۔ آپ کو کئی بار دیکھا ہے۔''

کرونا نے اُس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا: ''اچھا، تو آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔''

''آپ کو اگر جلدی نہ ہو تو سامنے کے ریستوران میں بیٹھ کر ایک کپ کافی کا ہو جائے۔'' رام موہن نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

کرونا نے سندھیا سے پوچھا: ''کیا خیال ہے؟''

سندھیا نے جواب دیا: ''جیسے تمھاری مرضی۔''

پہلی ملاقات کے بعد رام موہن اُن سے گاہے بگاہے ملتا رہتا۔ مگر سندھیا کو یہ پسند نہیں تھا۔ کیونکہ اُس کی ساری توجہ کرونا کی طرف تھی۔ سندھیا کو احساس ہونے لگا کہ وہ ضرور کرونا سے اکیلے میں ملتا ہوگا، مگر وہ اُس سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک بار اُس نے کرونا سے کہا: ''لگتا ہے وہ تم پر لٹو ہے۔ بات کرنا تو درکنار وہ میری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔''

کرونا نے جواب دیا: ''سندھیا! آج کل کے جوان محض عورت کو نہیں دیکھتے اُس کے جسم کی بناوٹ کو بھی دیکھتے ہیں۔ اپنے جسم میں اصلاح کرو۔''

سندھیا نے کبھی اپنے جسم کی بناوٹ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ جہاں ماس کم ہونا چاہیے وہاں زیادہ تھا، جہاں زیادہ ہونا چاہیے وہاں کم تھا۔ مطلب یہ کہ جہاں اُس کی چھاتیاں اُبھری ہوئی ہونی چاہیے تھیں وہاں وہ دبی ہوئی تھیں، جہاں اُس کا پیٹ ہموار ہونا چاہیے تھا وہاں وہ اُبھرا ہوا تھا۔ جبھی تو وہ چار پانچ مہینے کی حاملہ لگتی تھی۔ اُس کی ناک بھی پچکی ہوئی تھی۔ کپڑے تھے تو قیمتی لیکن سلے ہوئے ڈھنگ کے نہیں تھے۔ اُس نے کرونا سے پوچھا: ''تو کیا کروں؟''

کرونا نے اسے سمجھایا: ''روہتک روڈ پر تم نے موڈرن بیوٹی کلینک دیکھا ہوگا۔ وہاں چلی جاؤ وہ تمھاری شکل اور بناوٹ کو ایسا بدل دیں گے کہ تم خود کو بھی نہیں پہچان سکو گی۔ خرچ تو ہوگا ہی مگر تمھارے پاس کوئی کمی نہیں۔''

سندھیا نے وہی کیا۔ بیوٹی کلینک کی مالکن نے اُسے سمجھایا کہ پہلے اُسے اپنا وزن کم کرنا پڑے گا جس کے لیے نہ صرف خوراک کم کرنی پڑے گی، کھانے میں گھی اور شکر کی مقدار بھی کم کرنی پڑے گی اور کیونکہ چٹپٹی چیزیں کھانے سے بھوک زیادہ لگتی ہے، اچار چٹنی وغیرہ سے پرہیز کرنا پڑے گا۔ سندھیا کو گول گپے، پاپڑی اور گھی میں تلی یا بھونی ہوئی چیزیں

کھانے کا بہت شوق تھا۔ جہاں وہ بیوٹی کلینک میں جا کر وزن کم کرنے کے لیے مشین پر ورزش کرتی، گھر آ کر پھر کھانے لگتی۔ وزن کو معیار پر لانے کے لیے تین مہینے لگ گئے۔

اب باری آئی چھاتیوں کی۔ کلینک والوں نے اُسے کھانے کے لیے کچھ گولیاں دیں اور ہر ہفتے سلی کون کا انجکشن دیا۔ چھاتیوں میں اُبھار لانے کے لیے دو مہینے لگ گئے۔ اس دوران کرونا نے اسے ایک فیشن دار کپڑے سینے والے کی دُکان اور ہیئر ڈریسر یعنی سر کے بال سنوارنے والی دُکان کا راستہ دِکھایا۔ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی ناک کا نشیب رہ گیا جس کی وجہ سے چہرے میں وہ کشش نہیں تھی جو دیکھنے والوں کو آہ بھر کر دوبارہ دیکھنے کے لیے مجبور کردے۔ ناک کے نشیب کی وجہ سے چہرے کی ایک دو جھرّیاں بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ کلینک کی مالکہ نے کہا: ''اس کے لیے آپ کو کاسمیٹک سرجری یعنی فنِ جرّاحی کے ذریعے آرائشِ جمال کی اشیا کا استعمال کر کے چہرے کی بناوٹ بدلنی پڑے گی۔ سارے کام پر کوئی بیس ہزار روپے خرچ ہوگا۔''

جب سندھیا نے اس کا ذکر پریم ناتھ سے کیا تو اُس نے بگڑ کر کہا: ''کیا کہہ رہی ہو تم؟ چہرے کی نمائش کرنی ہے کیا؟'' اُسے کیا معلوم کہ واقعی وہ چہرے کی نمائش کرنا چاہتی تھی۔ جب نشی نے یہ بات سنی تو وہ بھولا ناتھ سے کہنے لگی: ''اگر سندھیا نے ایسا کیا تو میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ میں بھی سرجری کرواؤں گی۔'' سندھیا اپنی بات پر اڑ گئی اور آخر پریم ناتھ مان ہی گیا۔

جب سندھیا کا سارا حلیہ بدل گیا تو وہ تیس سال کی عمر میں بیس سال کی دوشیزہ لگنے لگی۔ اب اُس کی چال ڈھال میں بھی کافی فرق آ گیا تھا۔ ایک چھوڑ کئی نوجوان اُس کا دم بھرنے لگے۔ سریندر نام کے ایک بانکے نوجوان سے اُس کی آنکھ لڑ گئی۔ جہاں وہ گھر سے دو چار گھنٹے غائب رہتی تھی، اب کئی کئی گھنٹے غائب رہنے لگی۔ اُس کی ساس نے کئی بار پریم ناتھ کو آگاہ بھی کیا مگر وہ اپنے کام میں اتنا مصروف رہتا تھا کہ اُسے اس موضوع پر بات کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ سیتا اور نشی کو بھی اُس کے چال چلن پر شک ہونے لگا۔ مگر

انھوں نے سوچا جب اُس کے شوہر کو کوئی پروا نہیں تو وہ کیوں بے کار میں اپنا سر کھپائیں۔

کئی مہینے تک سندھیا اور سریندر کی عشق بازی چلتی رہی۔ مگر ایک ہی عاشق سے اُس کا جی اجیرن ہو گیا۔ باتوں باتوں میں اسے معلوم ہوا کہ کرونا نے بھی اپنا یار بدل لیا تھا۔ دراصل کرونا کو سریندر بہت پسند تھا۔ اُس نے سندھیا کو اپنے اپنے یار بدلنے کا سُجھاؤ دیا مگر اس طرح سے کہ اُن کو شک نہ پڑے۔ اس دن دونوں نے اپنے اپنے عاشق کو پکچر دیکھنے کے لیے بلایا۔ منصوبہ کے مطابق کرونا اور اس کا یار پہلے سینما ہال میں جا کر بیٹھ گئے۔ پکچر شروع ہونے پر جب ہال میں اندھیرا ہوا تو سندھیا اور سُریندر اندر گئے۔ سندھیا کرونا کے یار کے ساتھ والی کُرسی پر بیٹھ گئی اور کرونا سریندر کے ساتھ۔ سندھیا اور کرونا کے یار نے آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے چھیڑ خانی شروع کر دی۔ سردی کا موسم تھا۔ سندھیا نے اپنی شال ٹھیک کرنے کے بہانے سے ڈھیلی چھوڑ دی۔ کرونا کے یار نے کُرسی کی ایک طرف سے اپنا ہاتھ اُس کی شال کے اندر کر لیا۔ دونوں مزے لینے لگے تو وقت کا پتہ نہیں چلا۔ اتنے میں جب وقفہ ہوا تو ہال کی ساری بتّیاں جل گئیں۔ کرونا کے یار نے فوراً اپنا ہاتھ شال کے اندر سے نکال لیا مگر جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو ہکّے بکّے رہ گئے اور فوراً حال سے اُٹھ کر چلے گئے۔ سندھیا اور سریندر بھی اُن کے پیچھے پیچھے گئے مگر وہ ایک ہی گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ دونوں کو کچھ سمجھ نہیں آیا کہ آخر ہوا کیا۔

جب سندھیا دو چار دن تک کرونا سے ملنے نہیں آئی اور نہ ہی مجلس میں شرکت کی تو کرونا نے اُسے گھر پر ٹیلی فون کیا۔ جواب ملا ''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' جب کرونا نے کچھ اور پوچھنا چاہا تو جواب دینے والے نے فون بند کر دیا۔ اُس نے دو تین بار پھر کوشش کی مگر اُسے ہر بار وہی جواب ملا ''وہ گھر پر نہیں ہے۔'' اُسے تشویش ہوئی مگر وہ اُس کے گھر جا کر پوچھنے سے گھبراتی تھی۔ سوچنے لگی تھوڑا اور وقت گزرنے دو، ایک نہ ایک دن سندھیا ضرور آئے گی۔ مگر وہ نہیں آئی۔

کرونا کا نیا عاشق سندھیا کا شوہر پریم ناتھ تھا۔ اُس حادثے کے بعد وہ اگلے دن

سندھیا کو اُس کے ماں باپ کے گھر کانپور چھوڑ آیا اور یہ ہدایت کی ''اسے اب واپس دلی مت بھیجنا نہیں تو مجھ جیسا بُرا کوئی نہیں ہوگا۔'' جب سندھیا کے باپ نے پوچھا ''آخر بات کیا ہے؟'' تو پریم ناتھ نے جواب دیا۔ ''اس سے ہی پوچھ لو۔''

سندھیا بیچ میں بول اُٹھی ''مجھ پر تہمت لگانے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا ہوتا تو اچھا رہتا۔ اگر تمھیں باہر دوسری عورتوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی آزادی ہے تو مجھے کیوں نہیں ہے۔ جس عورت کے ساتھ تم گھومتے ہو آخر وہ کسی کی بیوی یا بیٹی تو ہوگی ہی۔''

سندھیا کے والدین سمجھ گئے کہ دونوں کے چال چلن کو زنگ لگ گیا تھا۔ یہ سوچ کر وہ چپ رہے کہ وقت گزرنے پر سمجھوتا کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔ دو مہینے کے بعد کرونا اپنی محفل کے ایک رکن کو ساتھ لے کر سندھیا کے گھر گئی۔ نِشی نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانتے تھے کیونکہ کئی بار محفل سندھیا کے گھر پر ہو چکی تھی جس میں نِشی بھی شریک ہوئی تھی، مگر نِشی نے اُسے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔ کرونا نے پوچھا ''سندھیا کہاں ہے؟''

نشی نے بے رُخا جواب دیا ''وہ اب یہاں نہیں رہتی۔''

کرونا کو حیرانی ہوئی۔ پوچھنے لگی ''کہاں رہتی ہے؟''

اس سے پہلے کہ نِشی کوئی جواب دیتی اُس کی ساس جو پیچھے کھڑی تھی، غصّے سے بول پڑی ''وہ جہنم میں رہتی ہے۔ تمھیں ملنا ہے تو وہاں چلی جاؤ۔''

کرونا منہ لٹکا کر اپنی سہیلی کے ساتھ واپس آ گئی۔ وہ سندھیا سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ آخر ہوا کیا۔ مگر وہ کیا کرتی۔ نہ تو اُس کو جہنّم کا راستہ معلوم تھا اور نہ ہی ایڈریس۔

OO

کنجوس جاٹ

روہتک ضلع سے پندرہ میل دُور پیلی گاؤں میں چوکھارام نام کا ایک زمین دار رہتا تھا۔ سارے گاؤں میں لگ بھگ آدھی زمین اُس کی تھی۔ موسم کے مطابق کئی طرح کی فصلیں اُگاتا تھا۔ کھیتوں پر کام کرنے کے لیے کئی مزدور لگا رکھے تھے مگر کھیتوں کی دیکھ بھال خود کرتا تھا۔ جتنی مزدوری وہ اپنے مزدورں کو دیتا تھا اس سے دوگنا کام وہ اُن سے لیتا تھا۔ ذات سے تو وہ جاٹ تھا مگر زمین دار ہونے کی وجہ سے گاؤں والے اُسے چودھری کہہ کر بلاتے تھے۔

زمینوں سے چوکھارام کی آمدنی بہت اچھی تھی مگر تھا وہ اوّل درجے کا کنجوس۔ جس مکان میں وہ اپنی بیوی اور چار لڑکوں کے ساتھ رہتا تھا، تھا تو وہ پکّی اینٹوں کا بنا مگر کم سے کم لاگت کا۔ گھر کے اندر اتنی ہی کھاٹ اور باورچی خانہ کے اندر اتنے ہی برتن تھے جتنے نہایت ضروری تھے۔ پہلے تو کوئی مہمان اس کے گھر رہنے کے لیے کم ہی آتا تھا۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے سے آ بھی جائے تو پڑوس سے کھاٹ اور بستر منگا لیتا تھا۔ مہمان ایک رات سے زیادہ نہیں رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر اُسے اگلے دن چلتا کرتا۔

اُس کے سب سے بڑے لڑکے جودھا رام کی شادی ہو چکی تھی۔ اُس کی بہو بھی اُسی مکان میں رہتی تھی۔ اُس کو نہ اپنی بیوی اور نہ ہی گھر کے کسی دوسرے رُکن پر اعتماد تھا۔ کھیتوں

کے علاوہ گھر کے خرچ کا حساب کتاب بھی خود سنبھالتا تھا۔ یہاں تک کہ آٹا دال اور گھر کی دوسری کھانے پینے کی اشیا وہ خود بازار سے لاتا تھا۔ چاہے پنساری کی دُکان ہو یا آٹا پیسنے والے کی چکّی، سب سے تول مول کرتا تھا۔ جتنا پیسہ بچ جاتا وہ اُس کا سونا خرید لیتا۔ اپنی خواب گاہ میں رکھی ہوئی لوہے کی ایک الماری میں وہ سارا سونا حفاظت سے رکھ دیتا تھا۔ الماری کی چابی ایک کپڑے کے ٹکڑے کے ساتھ باندھ کر اپنی قمیض کی جیب میں رکھتا تھا۔ اگر وہ غسل خانے جاتا تو چابی بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

چوکھا رام کی کنجوسی سے سب گاؤں والے واقف تھے۔ وہ نیا جوتا تب تک نہیں بنواتا تھا جب تک پرانا اتنا نہ پھٹ جائے کہ موچی اُس کی مرمّت کرنے سے انکار کر دے۔ ایک ہی دھوتی اور قمیض کئی کئی دن تک پہنے رکھتا تھا۔ وہ اُسے تب دھونے کے لیے دیتا تھا جب اُن میں سے بدبو آنے لگتی تھی۔ پگڑی تو تین مہینے میں ایک بار دُھلتی تھی۔ حقّہ پیتا تھا جس کی وجہ سے اُس کے منھ سے بدبو آتی تھی۔ جتنا خرچ وہ تمباکو پر کرتا تھا اتنا وہ شاید اپنے کھانے پینے پر بھی نہیں کرتا تھا۔ سردی میں نہ تو وہ کوئی کوٹ پہنتا تھا نہ ہی شال اوڑھتا تھا۔ ایک میلی سی رضائی سے جسم کو ڈھک کر کام چلاتا تھا۔ ہاں، اگر اُسے کسی بیاہ شادی پر جانا ہو یا گاؤں سے باہر کہیں جانا ہو تو وہ موٹے اُون سے بُنا ایک لمبا سویٹر پہن لیتا تھا۔

چودھری کا دوسرا لڑکا کالو رام اسکول سے دسویں پاس کر کے روہتک کالج میں آگے تعلیم پانے کے لیے جانا چاہتا تھا، مگر کالج کے خرچ کو دھیان میں رکھتے ہوئے چودھری نے اُسے نہیں جانے دیا۔ اُس کو یہ کہہ کر اپنے ساتھ کھیتوں میں کام پر لگا دیا کہ "پڑھ لکھ کر کیا کرے گا۔ کلرک بنے گا۔"

جسم سے تو چودھری دُبلا پتلا تھا مگر کھیتوں میں کام کرنے سے اُس کی ہڈیاں کافی مضبوط تھیں۔ پینتالیس سال کا ہوتے ہوئے بھی وہ ایک ہاتھ سے ایک من بوجھ کو اتنی آسانی سے اُٹھا لیتا تھا جیسے کسی اینٹ کو اٹھا رہا ہو۔ ایک شام وہ اپنے کھیتوں سے واپس گھر

جارہا تھا۔ راستے میں گلّو حلوائی کی دُکان آتی تھی۔ اُس کی دُکان کے آگے کھاٹ پر بیٹھے دو آدمی کچھ کھاپی رہے تھے۔ اچانک ان میں سے ایک کی نظر چودھری پر پڑی۔ اُس نے اپنے ساتھی سے کہا "وہ دیکھ میرے یار، جارہا ہے کنجوس مکھی چوس۔" اُس نے تو اپنی طرف سے آہستہ سے کہا تا کہ چودھری کو سنائی نہ دے مگر اُسے کیا معلوم کہ چودھری کے کان بہت تیز تھے۔ اُس نے سب سن لیا۔ وہ دُکان کی اوٹ میں جا کر کھڑا ہو گیا اور اُن دونوں دوستوں کی باتیں سننے لگا۔ انھوں نے سمجھا وہ دُور چلا گیا ہے۔ دوسرے ساتھی نے تصدیق کرتے ہوئے کہا "سالے کے پاس پہلے ہی اتنا مال ہے اور جوڑتا جارہا ہے۔ نہ جانے کیا کرے گا اس کا؟"

پہلے نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا: "کچھ کھاتا پیتا بھی نہیں تبھی تو اتنا دُبلا پتلا ہے۔"

دوسرے نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: "کھائے کہاں سے، سالے کا پیٹ ہی نہیں، لگتا ہے بِنا پیٹ ماں کے پیٹ سے نکلا تھا۔"

اُن کا حاشیہ چڑھانا چوکھا رام کو ناگوار گزرا۔ وہ اوٹ سے نکل کر اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ آتے ہی کہنے لگا: "کیا نکتہ چینی کر رہے تھے تم مجھ پر؟ میرا پیٹ ہی نہیں۔ کہو تو حلوائی کی دُکان پر جتنی مٹھائی پڑی ہے ساری کھا کر دکھادوں۔"

انھوں نے سمجھا چودھری ڈینگ مار رہا ہے مگر جب اُس نے دوبارہ اُنھیں للکارا تو دونوں دوست چکّر میں پڑ گئے۔ ایک نے کہا "چودھری تم تو بُرا مان گئے۔ ہم تو ہنسی مذاق کر رہے تھے۔"

چودھری نے جواب دیا: "ایسے تو بات ختم نہیں ہوگی، آج تو کھا کر دکھاؤں گا۔ لگی شرط۔"

دونوں ساتھی گھبرا گئے۔ اُنھیں محسوس ہوا کہ چودھری سے اپنی جان چُھڑانا اتنا آسان

نہیں۔ انھوں نے سوچا دُکان کی ساری مٹھائی کھانا تو دُور رہا چودھری تو دُکان میں پڑا برفی کا تھال بھی نہیں کھا سکے گا۔ اتنے میں دُکان کے آگے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ایک نے ان دونوں سے کہا "ارے بھائی بتاؤنا چودھری کو" برفی کے تھال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک نے کہا "اگر تم تھال میں پڑی ساری برفی کھا جاؤ تو برفی کے دام ہم دیں گے اور ساتھ میں دو سو روپے بھی۔ اور اگر تم ساری برفی نہ کھا سکے تو خالی برفی کے دام حلوائی کو دے دینا۔ بولو منظور ہے؟"

تھال میں کوئی چار سیر کے قریب برفی تھی۔ دونوں کو یقین تھا کہ ساری برفی کھانا تو درکنار چودھری ایک چوتھائی بھی نہیں کھا سکے گا۔ مگر چودھری نے فوراً جواب دیا "منظور ہے۔"

دوسرا ساتھی بولا: "مگر سارا تھال دو گھنٹے کے اندر اندر ختم کرنا ہوگا۔"

چودھری نے جھٹ سے کہا: "یہ بھی منظور ہے۔"

پھر کہنے لگا: "مگر ایک شرط ہے، جب تک میں ساری برفی ختم نہ کرلوں کوئی بھی شخص نہ تو مجھے ٹوکے گا اور نہ ہی کوئی نکتہ چینی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے تم شروع کرو۔" دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

چودھری نے کچّی گولیاں نہیں کھا رکھی تھیں۔ کہیں وہ لوگ مکر نہ جائیں یا بعد میں پس و پیش نہ کریں وہ کہنے لگا: "پہلے دو سو روپے نکال کر کسی تیسرے آدمی کو دے دو۔" انھوں نے دو سو روپے گلّو حلوائی کو پکڑا دیے۔ اب چودھری لگا برفی کھانے۔ آہستہ آہستہ جب تین چوتھائی تھال ختم ہوگیا تو دونوں دوستوں کے پسینے چھوٹنے لگے۔ اس وقت دو سو روپے بہت بڑی رقم تھی۔ اس کے علاوہ ایک سو روپے کی برفی بھی تھی۔ سب ملا کر پوری رقم اُن دونوں کے چھ مہینے کی کمائی تھی۔ مگر اب وہ اپنے وعدے سے مکر نہیں سکتے تھے۔ چودھری سے پیچھا چھڑانا ناممکن تھا۔

آخر کار چودھری ساری برفی کھا گیا اور گلّو حلوائی سے دو سو روپے شرط کے لے کر چلتا

بنا۔ گھر جاتے ہوئے راستے میں حکیم سے جلاّب کی پڑیا لے لی۔ رات کو پانچ بار رفع حاجت کے لیے اُٹھ کر گیا۔ سورج طلوع ہونے سے پیشتر وہ ساری برفی پیٹ سے نکال چکا تھا۔ اُس دن سے کوئی بھی گاؤں والا چودھری سے نہ تو کسی طرح کا پنگا لیتا تھا اور نہ ہی کوئی شرط لگاتا تھا۔

چودھری کے کھیتوں کا سارا مال روہتک منڈی میں جاتا تھا۔ مال کی بِکری کی رقم آڑھتی اُس کے گھر بھجوا دیتا تھا۔ کبھی کبھی حساب کتاب کرنے کے لیے اور خاص طور پر اگر رقم آنے میں دیر ہو جائے تو وہ خود روہتک چلا جاتا تھا۔ اگر مال ساتھ لے جانا ہو تو اپنی بیل گاڑی میں جاتا تھا اور اگر اکیلا ہو تو تانگے میں جاتا تھا۔ ایک رات اُس نے چودھرائن سے کہا: ''چودھرائن، کل مجھے روہتک جانا ہے۔ آڑھتی سے حساب کرنا ہے، اور بھی شہر میں ایک دو کام ہیں۔ تڑکے نکل جاؤں گا۔ ساتھ لے جانے کے لیے ہمیشہ کی طرح کھانا باندھ دینا۔''

صبح جب چودھری گھر سے نکلا اُسے تانگہ نہیں ملا۔ اس نے سوچا پیدل ہی چلا جاتا ہوں۔ پندرہ میل ہی تو ہے۔ جب وہ چار میل آگے نکل گیا، اُسے خیال آیا کہ کھانے کی گٹھری تو وہ گھر بھول آیا ہے۔ اُس نے سوچا اتنی دور واپس جانے میں کوئی تک نہیں۔ راستے میں کسی ڈھابے سے کھا لوں گا۔ آٹھ میل چلنے کے بعد اُسے بھوک لگی۔ پاس میں ہی اُسے ایک ڈھابا دِکھائی دیا۔ اس نے ڈھابے والے کو دو روٹی بِنا چپڑی اور دال بِنا تڑکا لگائے دینے کو کہا۔ کیونکہ وہ فطرت سے کنجوس تھا، وہ کھانے پر کم سے کم خرچ کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چکا، اُس نے دُکاندار سے دام پوچھے۔ اُس نے کہا ''ایک روپیہ۔''

ایک روپے کا نام سن کر چوکھا رام کو پسّو کاٹنے لگے۔ کہنے لگا: ''میں نے تو صرف دو روٹیاں کھائی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ دو آنے ہونے چاہئیں۔ تم آٹھ گُنا مانگ رہے ہو۔''

ڈھابے والے نے جواب دیا: ''یہاں روٹی کا حساب نہیں۔ تھالی کا حساب ہے۔ دو روٹی کھاؤ یا دس ایک روپیہ لگتا ہے۔''

چوکھارام نے کہا" ٹھیک ہے مَیں اور کھالیتا ہوں۔"

" ڈھابے والے نے کہا" کیونکہ پہلی تھالی تمھارے کہنے سے اُٹھالی گئی ہے اب اور کھاؤ گے تو دوسری تھالی کا ایک روپیہ دینا پڑے گا۔" چودھری نے جواب دیا" ٹھیک ہے۔ دے دوں گا۔"

ڈھابے کا مالک ایک تھالی میں چار روٹیاں، دو کٹوریوں میں دال اور سبزی، کچا پیاز اور اچار رکھ کر لے آیا اور چودھری کے آگے میز پر رکھ دی۔ چودھری ساری روٹیاں اور دال پھٹا پھٹ چٹ کر گیا۔ پھر ڈھابے والے کو آواز لگائی" اور لے آؤ" پھر اُتنا ہی کھانا وہ پھر لے آیا جو چودھری جلدی سے کھا گیا۔ پھر آواز لگائی" اور لے آؤ۔" ایسے کرتے کرتے چودھری بتیس روٹیاں، آٹھ کٹوری دال اور آٹھ کٹوری سبزی ہڑپ کر گیا۔

اب ڈھابے والے کو پسّو کاٹنے لگے۔ وہ ایک بڑے سے لوٹے میں پانی بھر کر لے آیا اور چودھری کے آگے رکھ کر کہنے لگا:" چودھری، پیاس لگی ہوگی، پانی پی لو۔" جب چودھری نے یہ کہا" پانی تو میں آدھا کھانا کھانے کے بعد پیتا ہوں" تو ڈھابے والے کے پسینے چھوٹنے لگے۔ بتیس روٹیاں کھانے کے باوجود بھی ابھی اُس کا آدھا کھانا پورا نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ اسی طرح سے کھاتا رہا تو خدا جانے کیا ہوگا۔ وہ تو کنبھ کرن کا بھی باپ نکلا۔ ڈھابے والا گہری سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ایک دم چودھری کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور رونی صورت بنا کر کہنے لگا:" مجھ سے بھول ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ تمھارے پاؤں پڑتا ہوں۔"

اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے چودھری نے کہا:" مجھے آرام سے کھانے دو۔ یوں پریشان نہ کرو۔"

ڈھابے والا چودھری کے پاؤں پڑ گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا" چودھری اگر تم اس رفتار سے کھاتے رہے تو میرا آج ہی دیوالہ نکل جائے گا۔ مجھے پر ترس کھاؤ، میرے مالک۔ میں اس تھالی کا ایک روپیہ چھوڑ دیتا ہوں اور پچھلی تھالی کا بھی۔" چودھری نے پانی پیا

اور وہاں سے چلتا بنا۔ روہتک پہنچ کر اُسے معلوم ہوا کہ آڑھتی باہر گیا ہوا ہے اور شام کو لوٹے گا۔ وہ رات کو آٹھ بجے آیا۔ حساب کرتے کرتے نو بج گئے۔ چودھری رات کو آڑھتی کی دُکان پر سو گیا اور سورج نکلتے ہی وہاں سے پیدل چل پڑا۔ راستے میں وہ پھر اُسی ڈھابے پر رُکا جہاں اُس نے گئے دن گھر سے آتے وقت کھانا کھایا تھا۔ جب ڈھابے والے نے اُسے دیکھا تو وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا "چودھری ابھی کھانا بنا نہیں ہے۔"

"کتنی دیر لگے گی؟" چودھری نے پوچھا۔

"کم سے کم ایک گھنٹہ!" ڈھابے والے نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے میں انتظار کر لیتا ہوں۔"

ڈھابے والے کو ایک بار پھر پتو کاٹنے لگے۔ اُس نے چودھری سے بڑی حلیمی کے ساتھ کہا: "چودھری اتنی دُور سے آ رہے ہو، تھک گئے ہو گے۔ پاس کے کنویں پر جا کر نہا دھولو۔ تھکاوٹ بھی دُور ہو جائے گی اور بھوک بھی لگ آئے گی۔ جب تک تم واپس آؤ گے کھانا بھی تیار ہو جائے گا۔"

چوکھا رام نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دس منٹ کے بعد وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ جب وہ نہا دھو کر واپس آیا اُس نے دیکھا کہ ڈھابہ بند تھا۔ ساتھ میں سائیکل مرمّت کرنے والے کی دُکان تھی۔ چودھری کے پوچھنے پر اُس نے بتایا: "وہ ڈھابہ بند کر کے گھر چلا گیا ہے۔ کہہ رہا تھا میرا جی متلا رہا ہے۔ سر میں چکّر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے بخار بھی ہے۔" یہ سن کر چوکھا رام دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔

جب چودھری گھر لوٹا تو چودھرائن نے پوچھا "آپ کھانے کی گٹھری تو گھر بھول گئے تھے۔ کیا کھایا تھا اور کہاں کھایا تھا؟"

چوکھا رام نے جواب دیا "چودھرائن فکر مت کرو۔ میں نے اتنا کھایا کہ مجھے ابھی تک بھوک نہیں ہے۔"

اُس کے لڑکے جودھارام نے سوال کیا "باپو! کہاں کھایا؟ دھرم شالہ میں یا گرودوارے میں؟"

جب چودھری نے بتایا کہ اس نے ڈھابے سے کھایا تھا تو جودھارام نے حیرانی سے پوچھا: "باپو! تم نے ڈھابے سے کھایا؟ سچ کہہ رہے ہو کیا؟ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ تم اپنی جیب سے تو کھانے والے نہیں ہو۔"

چودھری نے فوراً جواب دیا "بیٹا، میں بے وقوف نہیں ہوں۔" پھر اس نے جب سارا قصہ سنایا تو سب گھر والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جودھارام نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا "باپو! کنجوسی میں تمھیں کوئی مات نہیں دے سکتا۔"

OO

ہری رام کی بیوہ

نتھو پور ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کی کُل آبادی تقریباً چالیس ہزار تھی۔ شہر میں صرف ایک لمبا سا بازار تھا۔ اُس بازار میں ہری رام کی کپڑے کی دُکان تھی۔ ویسے تو ایسی دُکانیں تین اور بھی تھیں مگر ہری رام کا مال زیادہ بِکتا تھا۔ شہر والے تو اُس سے اتنا کپڑا نہیں خریدتے تھے مگر آس پاس کے گاؤں میں رہنے والے کئی اس کے پرانے گاہک تھے۔

کپڑا ناپنے کے لیے ہری رام نے لوہے کے دو گز رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک شہر والوں کے لیے تھا جو پورا چھتیس اِنچ تھا اور دوسرا گاؤں والوں کے لیے جو تین چوتھائی اَنچ کم تھا۔ اس کے علاوہ وہ کپڑا اتنی جلدی سے ناپتا تھا کہ ایک گز میں ایک چوتھائی اِنچ اور کم ہو جاتا تھا۔ اگر کبھی کوئی گاؤں والا اُس سے آ کر کہتا 'درزی کہہ رہا تھا کپڑا کم نکلا ہے' تو وہ سیدھا سا جواب دیتا۔ 'درزی خود کھا گیا ہوگا' کئی جان پہچان والے پُرانے گاہکوں کو وہ کپڑا اُدھار پر بھی دیتا تھا، مگر جب وہ اُدھار پر دیتا دام زیادہ لگاتا اور ناپ اور بھی کم ہو جاتا تھا۔

بازار کے دوسرے کونے میں ہری رام کا گھر تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کی بیوی اور کالی گائے رہتے تھے۔ اُس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب گائے دودھ دینا بند کر دیتی وہ اُسے بیچ کر دوسری لے آتا تھا مگر اولاد نہ ہوتے ہوئے بھی اُس نے اپنی بیوی کو نہیں بدلا۔ اُس کی بیوی کا کوئی اپنا نام نہیں تھا۔ شادی سے پہلے ہوگا مگر شادی کے بعد نہیں۔ ہری رام اُسے گھر والی کہہ کر بلاتا تھا۔ دوسرے لوگ، رشتے دار اور اڑوس پڑوس والے اُسے 'ہری رام کی گھر والی'

کہہ کر بلاتے تھے۔ اُس زمانے میں نہ ہی راشن کارڈ ہوتا تھا اور نہ ہی بینک کھاتہ جس کے لیے بیوی کے نام کی ضرورت پڑے۔

ہری رام کی گھر والی ویسے بھی اَن پڑھ تھی۔ دس تک گننا ہو تو انگلیوں سے گنتی تھی۔ سارا دن گھر کے کام میں لگی رہتی تھی۔ فرصت ملنے پر وہ پڑوس کی عورتوں کے منڈلی میں بیٹھ کر گپ شپ کرتی تھی۔ ہر صبح چھ بجے اُٹھ کر چکّی پر آٹا پیستی تھی۔ گائے کے گوبر کے اوپلے بنا کر سکھانے کے لیے چھت پر ڈالتی تھی۔ کھانا بناتی اور برتن بھی صاف کرتی تھی۔ پہننے کے لیے اپنی خواہش کے مطابق کپڑا دُکان سے آجاتا تھا۔ کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اسی لیے وہ اپنے شوہر سے بہت خوش تھی۔ شوہر کی خدمت کرنا نہ صرف وہ اپنا فرض سمجھتی تھی بلکہ دھرم بھی۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنے شوہر کو پرمیشور مانتی تھی۔

گھر کی گاڑی جب تک چلتی رہے چلتی رہے۔ کون جانے کب رُک جائے اور کس وجہ سے رُک جائے۔ ایک دن ہری رام کی گھر والی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اُس کی تقدیر کی گاڑی پٹری سے ایسی اُتری کی چوُر چوُر ہوگئی۔ رات نو بجے ہری رام سوامی گیان چندر جی مہاراج کی کتھا سن کر جب گھر لوٹا تو آتے ہی بستر میں لیٹ گیا۔ ایسا لیٹا کہ پھر اُٹھا ہی نہیں۔ لوگ کہنے لگے قسمت والا تھا سوتے سوتے سانس چھوڑ دی۔ نہ کوئی درد نہ کوئی بیماری۔ مگر اس کی گھر والی کے لیے یہ حادثہ اذیت دہ تھا۔ رسم و رواج کے مطابق رنگ برنگے چمکیلے کپڑے اُتار کر سفید معمولی کپڑے پہننے پڑے۔ کانوں سے سونے کی بالیاں، گلے سے سونے کا ہار، ہاتھوں کی اُنگلیوں سے سونے کی تین انگوٹھیاں اور کلائی سے سونے کی چوڑیاں اُتار دی گئی جن کو وہ اب نہیں پہن سکتی تھی۔ سر منڈوا دیا گیا جسے اب ہمیشہ کے لیے منڈوا کر رکھنے کے لیے پنڈت جی نے ہدایت کی۔ سب سے زیادہ فکر مند بات یہ تھی کہ وہ اکیلی پڑ گئی تھی۔ گائے ساتھ تو رہتی تھی مگر نہ تو وہ اُس کے غم میں شریک ہو سکتی تھی اور نہ ہی بات چیت کر سکتی تھی۔ سب لوگ اب اُس کو 'ہری رام کی بیوہ' کہہ کر بلانے لگے۔

اب سوال یہ کھڑا ہو گیا کہ ہری رام کی دُکان کا کیا کیا جائے۔ ہری رام کا ایک بھائی

تھا جو تھوپور سے پانچ میل کی دُوری پر ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اُس کا نام لکھن پال تھا۔ اُس کا ایک لڑکا تھا جس کا نام مہندر تھا۔ اس وقت مہندر کی عمر کوئی اٹھارہ سال تھی۔ لکھن پال نے اپنی بھابھی یعنی ہری رام کی بیوہ سے کہا ''بھابھی! میرا ایک مشورہ ہے۔ تمھیں ٹھیک لگے تو ہاں کر دینا اور اگر ٹھیک نہ لگے تو بھی رنجش کی بات نہیں ہوگی۔ ہم کوئی اور راستہ نکال لیں گے۔''

ہری رام کی بیوہ نے کہا ''آپ بتائیے تو سہی۔''

لکھن پال نے کہا ''اپنے بھتیجے کو دُکان پر بٹھالو۔ وہ ہر مہینے تمھارے خرچ کے لیے ایک بندھی رقم دے گا اور جو مال دُکان میں پڑا ہے اُس کا دام وہ اُسی طرح ہر مہینے قسطوں میں دیتا رہے گا۔'' ہری رام کی بیوی کو لکھن پال کی تجویز اچھی لگی۔ وہ فوراً مان گئی۔

ہر ماہ دو سو روپیہ دُکان کا کرایہ اور دو سو روپیہ دُکان میں پڑے مال کی قسط کا طے ہوا۔ مہندر کافی محنتی اور ساتھ ساتھ ہوشیار بھی تھا۔ دیکھتے دیکھتے دُکان چل پڑی۔ اقرار کے مطابق مہندر ہر مہینے چاچی کو چار سو روپیہ اُس کے گھر دے آتا۔ ہفتہ میں ایک دو بار وہ ویسے بھی چاچی کی خیر و عافیت پوچھنے کے لیے اُس کے گھر چلا جاتا۔

ہری رام کی وفات کو ایک سال سے اُوپر ہو چکا تھا۔ مگر اُس کی بیوہ اُسے بھلا نہیں سکی۔ اُسے یاد کر کے بہت روتی۔ پڑوسنوں کو اکثر کہتی رہتی 'وہ مجھے ہر روز آسمان کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتا ہے۔ اشاروں سے وہ میری خیریت پوچھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اُس کی آنکھیں بولتی ہیں، میں تمھارے بغیر اُداس رہتا ہوں۔ تم کب آ رہی ہو'۔

ایک پڑوسن نے ہنس کر پوچھا: ''تو تم کب جا رہی ہو؟''

اُس نے جواب دیا: ''بہن، آنا جانا اپنے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جب نیلی چھتری والے کا بلاوا آئے گا، چلی جاؤں گی۔''

ایک دن ڈاکیہ ہری رام کے نام کی رجسٹری لے آیا۔ اُس نے ہری رام کی بیوہ کو آواز لگائی۔ جب وہ باہر آئی ڈاکیہ نے کہا: ''ہری رام کے نام رجسٹری ہے۔ وہ تو اب نہیں رہا تم لے لو۔'' ایک کاغذ نکال کر کہنے لگا ''یہاں دستخط کر دو۔''

اُس نے جواب دیا۔ ''مجھے دستخط کرنے نہیں آتے۔''

ڈاکیہ نے کہا ''انگوٹھا لگا دو۔''

جب وہ انگوٹھا لگا چکی ڈاکیہ نے پوچھا ''تمھارا نام کیا ہے؟''

اُس نے اپنے مرحوم شوہر کا نام کبھی نہیں لیا تھا اور اُس کا اپنا کوئی نام تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے منہ سے کیسے کہے کہ وہ ہری رام کی بیوہ ہے۔ اس نے ڈاکیہ سے کہا ''رُکو، میں آتی ہوں۔'' وہ جلدی سے گئی اور ایک پڑوسن کو بلا کر لے آئی۔ پڑوسن نے کہا: ''یہ ہری رام کی بیوہ ہے۔''

ڈاکیہ نے جھنجھلا کر کہا: ''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ اس کا نام کیا ہے؟ اس کے انگوٹھے کے نشان کے نیچے نام لکھنا ضروری ہے۔''

پڑوسن بولی ''اس کا کوئی نام نہیں ہے۔ سب اسے ہری رام کی بیوہ کہہ کر بلاتے ہیں۔''

ڈاکیہ انگوٹھا لگوا کر رجسٹری دے چکا تھا۔ واپس لینا مشکل تھا۔ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

اگلے دن جب مہندر نے لفافہ کھول کر چٹھی نکالی تو وہ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے پراپرٹی ٹیکس ادا نہ کرنے کا نوٹس تھا۔ اُس میں لکھا تھا کہ اگر ایک مہینے کے اندر ٹیکس جمع نہ کروایا گیا تو کارپوریشن جائیداد کی قرقی کروائے گی۔ مہندر نے چاچی سے کہا ''چاچی، تم فکر مت کرو۔ میں کل ہی کسی وکیل سے مشورہ کروں گا۔''

وکیل سے پوچھ کر مہندر نے چاچی کو بتایا: ''وکیل کہہ رہا تھا ساری جائیداد تمھارے نام کروانی پڑے گی۔ اس کے لیے تمھیں اپنا نام دینا پڑے گا۔''

چاچی نے ایک دم جواب دیا: ''میرا تو کوئی نام نہیں ہے۔ وکیل کو کہہ دینا وہی لکھ دے جو سب لوگ مجھے بلاتے ہیں۔''

''چاچی دفتری کاموں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر تمھارا کوئی نام نہیں تو اب رکھ لو۔''

چاچی نے حیرانی سے پوچھا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا؟ نام تو کبھی بھی رکھا جا سکتا ہے۔''

چاچی کو مہندر کی بات پر تعجب ہوا۔ کہنے لگی "اب اس عمر میں تم میرا نام سنسکار کرواؤ گے!"

مہندر نے ہنس کر کہا: "چاچی اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

لکھن پال کی رائے پر ہری رام کی بیوہ کا نام لکشمی بائی رکھ دیا گیا۔

دیوالی سے تین چار روز پہلے جب مہندر دُکان کی صفائی کر رہا تھا اُسے ایک چھوٹے سے صندوق کے اندر کچھ کاغذ ملے۔ جب اُس نے اُن کاغذوں کو کھول کر پڑھا وہ کسی زمین کے دستاویز تھے اور وہ زمین ہری رام کے نام تھی۔ اُس نے جب چاچی سے اس کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا "اس بارے میں مجھے کوئی علم نہیں ہے۔" کیونکہ زمین نگر کے ساتھ لگتی تھی اُس کے دام بڑھ گئے تھے۔ مہندر کی صلاح سے وہ زمین بیچ دی گئی جس سے پورے پچاس ہزار روپے نقد وصول ہوئے۔ اُس رقم کو ڈاک خانے کے بچت کھاتے میں ڈال دیا گیا۔ رات رات میں چاچی مالدار ہو گئی۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے مہندر کو خیال آیا کہ چاچی کی کوئی اولاد تو ہے نہیں۔ مرنے کے بعد اُس کا وارث تو مجھے ہونا چاہیے۔ اُس نے جب وکیل سے صلاح کی تو وکیل نے مشورہ دیا کہ چاچی سے اپنے نام وصیت کروالو۔ وصیت نہ ہونے پر مرے ہوئے رشتے دار بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ اُس نے سوچا موقع دیکھ کر چاچی سے بات کروں گا۔ مگر بات کرنے سے پہلے چاچی سے یارانہ کرنا ضروری تھا۔ اب وہ تقریباً ہر روز شام کو دُکان بند کر کے سیدھا چاچی کے گھر چلا جاتا اور اُس کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لڑاتا۔ کبھی کبھی ہنسی مذاق بھی ہو جاتا۔ موقع دیکھ کر وہ چاچی کو مکھن بھی لگاتا۔ ہفتے میں دو تین بار چاچی کے گھر کھانا کھا کر اپنے گھر جاتا۔ ایک شام اس نے چاچی سے کہا۔

"چاچی، تمھارے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں۔ اپنے رہن سہن کا طریقہ بدلو۔ سر منڈوانا بند کرو۔ سفید کپڑے اُتار کر اچھے کپڑے پہنو۔ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے؟"

لکشمی کو مہندر کی بات اچھی تو لگی مگر کہنے لگی "لوگ کیا کہیں گے؟"

مہندر نے جواب دیا: "چاچی! لوگوں کے کہنے پر جاؤ گی تو دنیا میں ایک پل بھی چین

سے زندگی بسر نہیں کرسکتیں۔ اگر کوئی کچھ کہہ بھی دے تو کانوں میں انگلی ڈال لو یا ایک کان سے سنو تو دوسرے سے نکال دو۔"

روز روز کی ملاقات سے لکشمی کو مہندر سے اُنس ہو گیا۔ شروع شروع میں تو وہ جھجک کر بات کرتی تھی، اب وہ اُس سے ایسے گھل مل گئی تھی جیسے بچپن کی دوستی ہو۔ پہلے وہ اُسے بچّے کی نظر سے دیکھتی تھی اب وہ اُسے مرد کی نظر سے دیکھنے لگی۔ وہ سوچنے لگی مہندر کو اپنے بس میں کرنے کے لیے اپنے آپ کو بدلنا پڑے گا۔ مہندر نے تو اُسے پہلے ہی اشاروں میں کہہ دیا تھا کہ اپنا حلیہ بدلو۔ چاچی نے آہستہ آہستہ وہی کیا جو مہندر نے کہا تھا۔

دو مہینے میں جب لکشمی کے بال لمبے ہو گئے۔ اُس نے پھر اپنا سر نہیں منڈوایا۔ سفید کپڑے اُتار پھینکے۔ اُن کی جگہ جدید فیشن کے سلے کپڑے پہننے لگی۔ بناؤ سنگار کے ساتھ اب وہ خوبصورت لگنے لگی۔ جہاں وہ پہلے پینتیس کی ہو کر پچاس کی لگتی تھی اب وہ پچیس کی دوشیزہ دکھائی دینے لگی۔ مہندر بھی اس کے خط و خال اور کھلا ہوا چہرہ دیکھ کر اُس کے چکّر میں آ گیا۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیسے چاچی کو پٹایا جائے کہ ایک دن چاچی نے اُس سے خود ہی کہا "مہندر، تم ہر روز گھر سے آتے ہو اور اتنی رات گئے واپس جاتے ہو، میرے گھر ہی سو جایا کرو۔"

مہندر نے اُسی رات اپنے باپو سے بات کی۔ وہ مان گیا۔ اُسے بھی لکشمی کی جائیداد کا لالچ تھا۔ مگر نہ تو وہ اپنے بیٹے کے دل کی بات کو سمجھ سکا اور نہ ہی اپنی بھابھی کی چال کو۔

لکشمی میں اچانک اتنی تبدیلی دیکھ کر پڑوس کی عورتوں کو حیرانی ہوئی۔ ایک پڑوسن نے اُس سے کہا "تمھارا میاں جب آسمان کی کھڑکی سے جھانک کر تمھیں اس شکل میں دیکھتا ہوگا تو کیا سوچتا ہوگا؟"

لکشمی نے بے رُخی سے جواب دیا "جو سوچتا ہوگا سوچنے دو۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں اُس سے بہت پریشان رہتی تھی۔ زمین خریدی مجھے بتایا نہیں۔ لگتا ہے اُس کے کسی چڑیل سے ناجائز تعلقات تھے۔ دُکان سے اتنی کمائی تھی نہ جانے کیا کرتا تھا؟"

مہندر کے کہنے پر لکشمی نے پرانے گہنوں کو پالش کروا کر اور کچھ نئے خرید کر پہننا شروع کر دیا۔ اب وہ کسی رانی سے کم نہیں لگتی تھی۔ جو آدمی کبھی اُس پر اپنی نظر نہیں جماتا تھا وہ اب اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ غیر تو غیر اب وہ مہندر کو بھی اچھی لگنے لگی اور جب مہندر کو چاچی کی جائیداد کا خیال آتا تو وہ اُسے اور بھی حسین لگتی۔

لکشمی تو پہلے ہی مہندر کی جوانی اور ڈیل ڈول پر فریفتہ تھی۔ اب دونوں اُس موقع کی تلاش میں تھے کہ کب ایک دوسرے کو اپنے دل کی بات بتائی جائے۔ انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔

ایک رات لکشمی اپنے بستر سے اُٹھ کر مہندر کے کمرے میں آئی اور اُس کی چارپائی کے نزدیک جا کر اُسے کہنے لگی "مہندر نہ جانے مجھے کیوں ڈر لگ رہا ہے۔ اپنی چارپائی میری چارپائی کے ساتھ ڈال لو۔" وہ تو پہلے سے ہی تیار تھا۔ جھٹ اپنی چارپائی اُٹھائی اور لکشمی کی چارپائی کے ساتھ لگا دی۔

اب ہر رات مہندر یہی کرتا۔ سونے سے پہلے اپنی چارپائی اُٹھا کر لکشمی کی چارپائی کے ساتھ لگا دیتا۔ صبح ہوتے ہی چارپائی وہاں سے ہٹا لیتا اور اپنے کمرے میں ڈال دیتا۔ اسی دوران مہندر نے چاچی سے اپنے نام وصیت کروالی۔

جہاں ہری رام لکشمی سے عمر میں بارہ سال بڑا تھا وہاں مہندر بارہ سال چھوٹا تھا۔ اگر سماج کی لعنت ملامت کا ڈر نہ ہوتا تو شاید وہ ایک دوسرے سے شادی کر لیتے پھر بھی وہ ایسے رہنے لگے جیسے شوہر اور زوجہ ہوں۔ تبھی تو کہتے ہیں جب میاں بیوی راضی کیا کرے گا قاضی۔

OO

رات ہی رات

نریلا سے کوئی دس میل دُور اینٹیں بنانے کا ایک بھٹہ تھا جس کا مالک بھوانی داس راجپوت تھا۔ برسات کے موسم میں مٹی گیلی ہونے کی وجہ سے تقریباً دو مہینے بند رہتا تھا۔ باقی دس مہینے کبھی کبھی چھوڑ کر چلتا رہتا تھا۔ کوئی نہ کوئی آرڈر مل ہی جاتا تھا۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ بھٹے سے اتنی آمدنی تھی کہ اُسے امیر بنا دیتی۔ پھر بھی وہ بڑے آرام سے رہتا تھا۔ ایک تو وہ سیدھا سادہ آدمی تھا۔ کوئی عیب نہیں تھا۔ نہ وہ شراب پیتا تھا نہ تمباکو نوشی کرتا تھا۔ دوسرے اُس کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ جب اُس کی عمر ساٹھ سال کی ہو گئی اُسے بھٹے کا کاروبار سنبھالنے میں کچھ مشکل پیش آئی۔ ہفتے میں تین چار دن نریلا سے پیدل چل کر جانا اور واپس گھر آنا اُسے اور بھی تھکا دیتا تھا۔ بھٹے پر کام کرنے والے کئی لوگ تھے۔ ایک منشی بھی تھا۔ مگر ایسا کوئی نہیں تھا جس پر اُسے اتنا اعتماد ہو کہ سارا کام اُس پر چھوڑ دے۔ اب اُسے ایک قابلِ اعتماد شخص کی ضرورت محسوس ہوئی یا پھر وہ بھٹے کو بند کر دے۔

بھوانی داس نے اپنے چھوٹے بھائی سے بات کی کہ اگر وہ اپنے لڑکے تیج بھان کو اُس کے ساتھ کام پر لگا دے تو سال کے آخر میں جو منافع ہو گا آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ اس کا بھائی مان گیا اور تیج بھان بھی ساجھے داری پر راضی ہو گیا۔ تیج بھان کی عمر اُس وقت کوئی اُنیس برس کی تھی۔ ہائی اسکول پاس کر چکا تھا۔ کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ مگر جب چاچا کی طرف سے یہ پیشکش آئی تو اُسے اچھی لگی۔ اُس نے کالج کی پڑھائی چھوڑ دی۔ کیونکہ چاچا

کے کوئی اولاد نہیں تھی اُس کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ چاچا کی وفات کے بعد بھٹے کا وہی واحد مالک ہوگا۔ اب بھوانی داس کا بھٹے پر آنا جانا کم ہو گیا۔ تیج بھان نے ایک موٹر سائیکل خرید لی جس سے اس کا ہر روز بھٹے پر آنا جانا آسان ہو گیا اور وقت کی بھی بچت ہو گئی۔

دھنی رام نام کے ایک ٹھیکے دار کو دہلی سرکار کی طرف ایک بہت بڑی عمارت بنانے کا ٹھیکہ مل گیا۔ اقرار نامے کے مطابق عمارت کی نیو پڑنے پر کل لاگت کا پچیس فیصدی پیشگی ملنا تھا، مگر چیک ملنے میں دیر ہو گئی۔ پہلے افسرِ معاہدہ کی منظوری چاہیے تھی۔ اُس کی مٹھی گرم کر کے دھنی رام نے کام کروایا۔ پھر بِل سرکاری دفتر میں دیا۔ اس کے بعد وزیر کے نجی سیکریٹری نے ٹیلی فون سے ٹھیکے دار کو اپنے دفتر میں بلایا۔ بلانے کا مقصد صاف تھا۔ وہاں سے دے دِلا کر فائل نکلوائی تو نجی سیکریٹری نے ہاتھ پھیلایا۔ اُسے بھی انعام دیا۔ اب وہاں سے فائل مال گاڑی کی رفتار سے چلتی اور راستے میں دو مقام پر ٹھہرتی محکمہ کے آفیسر کے پاس آ کر رُک گئی۔ وہاں لال سگنل تھا۔ کھانے پینے کا انتظام کرنے کے بعد فائل بِل بنانے والے کے پاس آ گئی۔ اُسے بھی تحفہ دیا۔ آخر میں خزانچی نے کہا ''چیک بک ختم ہو گئی ہے، بینک سے نئی لانی پڑے گی۔ کل دریافت کر لینا۔'' دھنی رام جانتا تھا کہ خدمت کیے بغیر کام نہیں چلتا۔ یعنی ایک انار سو بیمار۔ اسی چکّر میں چار مہینے گزر گئے۔ ایک سال کے اندر عمارت کھڑی کرنی تھی۔ وقت تھوڑا تھا۔ دھنی رام نے تیج بھان کو اینٹوں کی سپلائی بڑھانے کے لیے کہا۔ کام بڑھ جانے کی وجہ سے تیج بھان کو اب ہر روز بھٹے پر جانا پڑا۔ کبھی کبھی اُسے گھر واپس آنے میں دیر بھی ہو جاتی۔

ایک دن شام کے سات بج گئے۔ سورج غروب ہونے میں کچھ ہی منٹ رہ گئے تھے۔ بھٹہ ابھی چل رہا تھا۔ تیج بھان اگر چاہتا تو بھٹے کے ناظر پر کام چھوڑ کر گھر آ سکتا تھا مگر اُس نے دھنی رام سے اقرار کیا تھا کہ کل تک آرڈر کا سارا مال پہنچ جائے گا۔ اُس نے سوچا دس میل ہی کا تو فاصلہ ہے۔ چاہے راستہ کچا ہے پھر بھی وہ آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ جائے گا۔

وہ بھٹے پر رُک گیا اور جب کام پورا ہو گیا تو اُس وقت تقریباً نو بج چکے تھے۔ ابھی اُس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ بڑے زور سے آندھی چلنے لگی۔ گرد اتنی زیادہ تھی کہ اُسے صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُسے مجبوراً رُکنا پڑا۔

تیج بھان ایک پیڑ کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے بجلی چمکنے لگی اور زور سے بادل گرجنے لگے۔ اتنے میں بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اب بارش کبھی بھی آسکتی تھی۔ اُسے احساس ہوا کہ بارش اتنے زور سے آئے گی کہ وہ پیڑ کے نیچے کھڑا ہوا بھی بھیگ جائے گا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، اُسے کوئی محفوظ جگہ دکھائی نہیں دی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کہ اُس کی نگاہ اچانک کچھ دُور ایک پرانی عمارت پر پڑی جو کھنڈرات جیسی لگتی تھی۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہ جگہ عمارت کی سطح سے کچھ اونچی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنی موٹر سائیکل کو نیچے لے گیا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ صاف نہیں دِکھائی پڑتا تھا۔ پھر بھی اُس عمارت کو دیکھ کر اُسے یقین ہوا کہ وہ عمارت کسی پرانے زمانے کا کھنڈر تھا۔ اُس نے اسکول کے دنوں میں تواریخ میں پڑھا تھا کہ اُس علاقے میں کئی پرانے کھنڈرات تھے۔ شاید وہ شیر شاہ سوری کی بنوائی ہوئی ایک سرائے تھی۔

اس دوران بارش شروع ہو گئی۔ عمارت کے اندر جاتے ہوئے اُسے کچھ ڈر لگا۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ ایسی پرانی عمارتوں کے اندر کئی طرح کے جانوروں، پرندوں، کیڑوں وغیرہ کے گھر ہوتے ہیں۔ جیسے کہ بچھو، سانپ، گیدڑ، چمگادڑ، چھپکلی، اُلّو وغیرہ۔ ان سب کا وہاں ہونا ممکن تھا۔ وہ دماغی کشمکش میں اُلجھ گیا کہ کیا کروں۔ عمارت کے اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ دونوں صورتوں میں خطرہ مول لینے والی بات تھی۔ وہ اسی پس وپیش میں تھا کہ کیا کروں کہ اُسے کہیں سے ایک آواز سنائی دی: ''بارش بند ہونے والی نہیں ہے۔ ڈرو نہیں۔ اندر آ جاؤ۔ سر چھپانے کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ تو آخر چاہیے ہی۔ واپس جاؤ گے تو اس طوفان میں پھنسنے کا امکان زیادہ ہے۔''

وہ آواز سن کر پہلے تو تیج بھان بہت گھبرایا پھر ہمّت کر کے پوچھا ''تم کون ہو؟''

آواز نے جواب دیا: ”میں تمھارا پرانا حاکم ہوں۔ میرا نام شیر شاہ سوری ہے۔“

تیج بھان کا اندازہ کہ سرائے شیر شاہ سوری کے وقت کی تھی، ٹھیک نکلا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی حکومت کے دوران مسافروں کے آرام اور بہبودی کے لیے شیر شاہ نے کئی نیک کام کیے تھے۔ اُس نے سرائے بنوائیں، کنویں کھُدوائے، تالاب بنوائے، سڑکوں کے دونوں طرف پیڑ لگوائے تاکہ سفر کے دوران مسافروں کو کسی طرح کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اُس زمانے میں مسافر بیل گاڑیوں میں سوار ہو کر یا گھوڑوں پر بیٹھ کر یا پھر پیدل سفر کرتے تھے۔ اُن کے لیے یہ سہولیات بہت فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ مگر تیج بھان کو آواز کی شخصیت پر یقین نہیں آیا۔ وہ کہنے لگا ”مگر شیر شاہ سوری کی وفات کو تو اتنے سال ہو گئے ہیں اور تم......“

اس کی بات کو کاٹتے ہوئے آواز نے جواب دیا: ”میں شیر شاہ کی رُوح ہوں۔“ پھر آواز نے اُسے چوکنا کرتے ہوئے کہا ”دیکھو تم اور دیر مت کرو ورنہ بھیگ جاؤ گے۔ سردی لگ جائے گی۔ بیمار پڑ جاؤ گے۔“

تیج بھان نے ڈرتے ہوئے کہا ”مگر میں نے سنا ہے کہ عمارت کے اندر سانپ، گیدڑ، بچھو......“

اُس کی بات کو پھر کاٹتے ہوئے آواز نے کہا ”اِس وقت سب مزے سے سو رہے ہیں۔ سانپ اپنے بل میں، بچھو اینٹوں کے نیچے، چھپکلی دیوار پر، چمگادڑ چھت کے نیچے۔ اُلّو اینٹوں کے شگاف میں اور گیدڑ اپنی غار میں۔“

”کہیں وہ جاگ گئے تو؟“ تیج بھان نے سوال کیا۔

”وہ سب گہری نیند میں ہیں۔ اگر تم اُن سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرو گے تو وہ تمھیں کچھ بھی نہیں کہیں گے، وہ جانور ضرور ہیں مگر بے وقوف نہیں جیسا اکثر بہت سے لوگ سمجھتے ہیں۔“ آواز نے تیج بھان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ہمت سے کام لیتے ہوئے تیج بھان عمارت کے اندر چلا گیا۔ اُسے کھنڈر کا ایک چوڑا کونا خالی مل گیا جس کی چھت ابھی بھی مضبوط لگتی تھی۔ چار اینٹوں کو ملا کر وہ اُن کے اوپر بیٹھ

گیا۔ پھر اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہیں کوئی سانپ یا بچھو تو نہیں ہے۔ اُسے ایسا کچھ نظر نہیں آیا۔

''گھبراؤ نہیں، تم جوان آدمی ہو، حوصلہ اور ہمت سے کام لو۔'' آواز نے کہا۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔ کیا کروں؟'' تیج بھان بولا۔

''تم ہڑبڑاہٹ میں بھول گئے کہ پانی تمھارے تھرمس میں ہے جو موٹر سائیکل کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔''

''مجھے بھوک بھی لگی ہے۔''

''تم ہڑبڑاہٹ میں یہ بھی بھول گئے کہ دوپہر کا کھانا تم نے ڈھابے سے منگوایا تھا کیونکہ کوئی تم سے ملنے آیا تھا۔ جو کھانا تم ساتھ لائے تھے وہ ٹفن تمھاری موٹر سائیکل کی ڈِگی میں پڑا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہڑبڑاہٹ میں میں یہ سب کچھ بھول گیا تھا۔'' تیج بھان نے اپنی بھول کو مانتے ہوئے جواب دیا۔

سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر جب تیج بھان دِیا سلائی جلانے لگا تو آواز نے کہا ''یہ تم کیا کر رہے ہو؟ دِیا سلائی کی روشنی سے ہو سکتا ہے کہ جانور جاگ جائیں۔ اُن کا ایک دم گہری نیند سے جاگنا تمھارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مصیبت میں دماغ صحیح طور پر کام نہیں کرتا۔''

''تم اسے مصیبت کہتے ہو۔ تمھارے جیسے نوجوان کے لیے تو یہ ایک چھوٹا سا امتحان ہے۔ تم نے وہ کہاوت تو ضرور سنی ہوگی، جو ڈر گیا وہ مر گیا۔''

''ہاں آپ کی بات سو فیصدی درست ہے۔'' بات چیت کا رُخ بدلتے ہوئے تیج بھان نے کہا ''میں آپ کی آواز تو سن رہا ہوں اور مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ کہیں میرے نزدیک ہیں مگر میں آپ کو دیکھ نہیں سکتا۔ ایسا کیوں؟'' تیج بھان کسی قدر استعجاب میں تھا۔

''میں انسان نہیں ہوں۔ میں انسان کی روح ہوں۔ روح دِکھائی نہیں دیتی۔ ویسی

روح تمھارے اندر بھی ہے مگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے'' آواز نے فلسفہ کی بات کہی۔

''آپ میرے محسن بھی ہیں اور مُرشد بھی اور ساتھ ساتھ ظریف بھی۔'' تیج بھان نے تھوڑا مسکراتے ہوئے کہا۔

آواز نے ہنس کر کہا ''بس اب اور نہیں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی اب آرام کرلو۔ کافی تھک گئے ہو۔'' اتنا کہہ کر آواز چپ ہوگئی۔ کیونکہ تیج بھان تھکا ہوا تھا آواز کے خاموش ہوتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اُس کی آنکھ کھلی بارش بند ہو چکی تھی اور چاند ابھی بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تیج بھان نے اپنی گھڑی دیکھی تو پانچ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانور وغیرہ ابھی تک سو رہے تھے۔ وہ اُٹھ کر باہر آیا۔ اُسے اپنی موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے میں کچھ وقت لگا مگر آخر میں وہ چل پڑی۔ وہ اُس پر سوار ہو کر گھر کی طرف نکل پڑا اور گھر جا کر سو گیا۔

اگلے دن بھٹے پر وہ دیر سے گیا۔ اُسے راستے میں وہ کھنڈرات دکھائی نہیں دِیے جو اُس نے رات کو دیکھے تھے۔ وہ حیرت زدہ تھا کہ وہ کھنڈرات اتنی دیر میں کہاں غائب ہوگئے۔ وہ موٹر سائیکل سے اُتر کر ڈھلان سے نیچے گیا جہاں وہ کھنڈرات ہونے چاہیے تھے، مگر وہاں اینٹوں کا ایک پرانا بھٹہ تھا جو کئی سالوں سے بند پڑا تھا۔ اُسے ایسا لگا اُس کے ساتھ کوئی کرشمہ ہوا تھا یا پھر مصیبت میں اُس کے ساتھ اُس کی اپنی ہمت اور خود اعتمادی کام آئی تھی۔

OO

وکیل کی فیس

مشتاق احمد ہاشمی کا پرانی دلی کے نامور وکیلوں میں شمار ہوتا تھا۔ ویسے تو وہ فوجداری مقدمے لڑتا تھا مگر طلاق کا دعویٰ ڈالنے میں ماہرِ خصوصی تھا۔ کیونکہ ایک مسلمان مرد کے لیے اپنی زوجہ سے طلاق لینا کوئی مشکل بات نہیں تھی، اس لیے زیادہ تر مسلمان خواتین اُس کی موکّل تھیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی خاتون اُس سے صلاح مشورہ کرنے کے لیے آتی تھی۔ ہاشمی کی ادھیڑ عمر تھی۔ بیوی تھی اور چار بچے بھی۔ گھر اُس کا دریا گنج میں تھا۔ مگر دلّی کے جامع مسجد کے اُردو بازار میں ایک مکان کی دوسری منزل پر اپنا دفتر کھول رکھا تھا۔ اُس کے موکّل اُس سے وہیں ملنے آتے تھے۔ کمرے میں لکڑی کی دیوار بنا کر اُسے دو حصّوں میں بانٹ رکھا تھا۔ بڑے حصّے میں وہ خود بیٹھتا تھا اور چھوٹے حصّے میں، جو اندر داخل ہونے سے پہلے آتا تھا اُس کا منشی نند گوپال بیٹھتا تھا۔ پچھلے چودہ سال سے وہی منشی اُس کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ ہاشمی کے چال چلن اور اُس کی کرتوتوں سے خوب واقف تھا مگر وہ اُس کے نجی معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔ اتوار کو چھوڑ کر ہر روز مشتاق احمد صبح آٹھ سے دس بجے تک اور شام کو چھ سے نو بجے تک اپنے دفتر میں ملتا تھا۔ کئی عورتوں کو طلاق دلوانے میں کامیاب ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ خواتین میں کافی مشہور تھا۔ رنجیدہ عورتیں اکثر کہتی تھیں شوہر سے نجات پانی ہو تو ہاشمی کے پاس چلے جاؤ۔

ایک شام کوئی سات بجے ایک پردہ نشین عورت اپنے پانچ سال کے لڑکے کو ساتھ

لے کر ہاشمی سے اُس کے دفتر میں ملنے آئی۔ اُس وقت وہ اپنے دفتر میں بیٹھا اگلے دن کے مقدموں کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ جب وہ خاتون اندر جانے لگی تو منشی نے اُسے روک دیا۔ اُس سے پوچھا ''کیا کام ہے؟''

''وکیل صاحب سے ملنا ہے۔''

''وہ تو میں جانتا ہوں، کام کیا ہے؟'' منشی نے اونچی آواز میں کہا۔

''وہ تو میں وکیل صاحب کو ہی بتاؤں گی۔'' خاتون نے جھنجھلا کر کہا۔

''یہاں بیٹھو، وکیل صاحب اس وقت کام میں مصروف ہیں۔ پوچھ کر بتاتا ہوں۔''

وکیل صاحب مصروف ہوں یا نہ ہوں اُن کے کام کرنے کا اپنا ہی ڈھنگ تھا۔ نئے مؤکل کو انتظار کروانے میں اُن کی اہمیت بڑھتی تھی۔ کچھ ایسی ہی ہاشمی کی سوچ تھی۔

خاتون بگڑ کر زور سے بولی ''میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ مشکل سے یہاں آئی ہوں۔ میرا شوہر گھر آنے والا ہوگا۔ مجھے گھر میں موجود نہ دیکھ کر بگڑ جائے گا۔'' تھوڑی دیر رُکنے کے بعد کہنے لگی ''ٹھیک ہے۔ پھر کسی دن آؤں گی۔''

جب وہ جانے لگی تو ہاشمی نے اپنے کمرے سے کرسی پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی ''نند گوپال! محترمہ کو اندر بھیج دو۔''

ظاہر تھا وہ نئے مؤکل کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر کار وکالت اُس کا کاروبار تھا۔

ہاشمی کے کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی خاتون نے منہ سے نقاب ہٹا دیا۔ ہاشمی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بیٹھنے کو کہا۔ اگرچہ وہ سمجھ گیا تھا کہ خاتون اپنے خاوند سے طلاق لینے کے لیے اُس سے مشورہ کرنے آئی تھی پھر بھی اُس نے آنے کی وجہ پوچھی۔

خاتون نے کہا ''میں اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہوں۔''

''تمھارا نام کیا ہے؟ طلاق کیوں لینا چاہتی ہو؟''

''میرا نام فیروزہ ہے۔ میرے خاوند کا نام رحیم خان ہے۔''

''میں نے پوچھا طلاق کیوں لینا چاہتی ہو؟''

"وہ مجھے مارتا ہے۔"

"کیا کرتا ہے تمھارا خاوند؟"

"قصائی ہے۔ جامع مسجد میں گوشت کی دُکان ہے۔"

تھوڑا چپ رہنے کے بعد کہنے لگی۔ "جیسا اُس کا پیشہ ہے ویسا ہی سلوک وہ میرے ساتھ کرتا ہے۔ کبھی گال پر طمانچہ مارتا ہے تو کبھی ڈنڈی سے میرے چوتڑوں پر مارتا ہے۔ کبھی مکّے سے مارتا ہے تو کبھی سر کے بال کھینچتا ہے۔ ایک دن تو اُس نے چھری اُٹھا لی۔ اگر میں شور نہ مچاتی تو وہ بکرے کی طرح مجھے بھی حلال کر دیتا۔ وکیل صاحب، کیا......"

ہاشمی نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا "فیروزہ بیگم، باقی میں بعد میں تفصیل سے پوچھ لوں گا۔ پہلے میری فیس کی بات ہو جائے۔"

فیروزہ گھبرا کر بولی۔ "کتنی فیس ہے آپ کی؟"

"صرف گیارہ سو روپے۔"

گیارہ سو کا نام سن کر فیروزہ کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے الفاظ اُس کے منہ سے نکلے "وکیل صاحب، میں اتنی فیس نہیں دے سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ یک مشت نہیں دے سکتیں تو تین چار قسطوں میں دے دینا۔ مگر پھر بھی کم سے کم پانچ سو روپے پیشگی دینے پڑیں گے۔ جب پیسوں کا انتظام ہو جائے آ جانا۔ مقدمہ میں تیار کر دوں گا۔ انشاء اللہ فتح تمھاری ہو گی۔"

فیروزہ مایوس ہو کر جانے لگی تو ہاشمی نے تسلّی دیتے ہوئے کہا "گیارہ سو خالی میری فیس نہیں ہے۔ عدالت میں بھی خرچہ ہوتا ہے۔ کارندوں کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ کچھ نہ کچھ انتظام تو تمھیں کرنا پڑے گا۔ جتنی رعایت میں کر سکتا ہوں، کر دوں گا۔"

ہاشمی گھِسا پِٹا وکیل تھا۔ کوئی نہ کوئی خاتون اُس کے چنگل میں پھنس جاتی تھی۔ فیروزہ دیکھنے میں اچھی تھی، جوان بھی تھی۔ اُسے دیکھ کر ہاشمی کا دل تو پھسل ہی گیا تھا مگر اُس نے دھوپ میں بال سفید نہیں کیے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ دوبارہ آئے گی اور وہ آئی۔

اگلی بار فیروزہ کے آتے ہی ہاشمی نے پوچھا" پیسے لائی ہو۔" فیروزہ نے ڈرتے ہوئے اپنی جیب سے سو سو روپے کے دو نوٹ نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ پھر منہ بنا کر کہنے لگی" اس وقت تو میرے پاس اتنے ہی ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا۔ اتنے پیسے تو مقدمے کے تیاری پر خرچ ہو جائیں گے۔"

"وکیل صاحب، آپ اطمینان رکھیے۔ میں آپ کو تھوڑا تھوڑا کر کے آپ کی ساری فیس ادا کر دوں گی۔ آپ مقدمہ تو تیار کیجیے۔"

ہاشمی نے مسکرا کر کہا" ٹھیک ہے مقدمہ تیار کر دیتا ہوں۔ اب مجھے تفصیل سے بتاؤ رحیم خان تمھارے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔"

فیروزہ نے ایک بار پھر وکیل کو بتایا کہ وہ اُسے کیسے مارتا ہے۔ ہاشمی نے پوچھا" اگر وہ آئے دن تمھیں پیٹتا ہے تو تمھارے جسم پر نشان تو ہوں گے۔"

"ہاں ہیں، کئی نشان ہیں۔"

"اچھا! تو دیکھنے پڑیں گے۔" ہاشمی نے سنجیدگی سے کہا۔

فیروزہ حیرت سے پوچھنے لگی۔ "وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ اگر عدالت نے تمھارا ڈاکٹری معائنہ کروانے کے لیے حکم دیا اور معائنہ کی رپورٹ میں نشان نہ ہوئے تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ ایک تو رحیم خان جھوٹا مقدمہ کرنے پر تمھارے خلاف فوجداری دعویٰ ڈال دے گا۔ دوسرے میں بھی جھوٹا مقدمہ بنانے کے جرم میں تمھارے ساتھ پکڑا جاؤں گا۔ اس لیے مقدمے کی درخواست میں مَیں وہی کہوں گا جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"تو آپ میرے جسم کا معائنہ کریں گے۔"

"تمھاری مرضی ہے۔"

ہاشمی نے دو سو روپے میز سے اُٹھا کر اُسے واپس پکڑانے کے ارادے سے ہاتھ آگے کرتے ہوئے کہا" سوچ لو، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ پھر کسی دن آ جانا۔"

فیروزہ گھبرا گئی۔ تھوڑا سوچنے کے بعد آہستہ سے کہنے لگی "ٹھیک ہے۔ آپ دیکھ لیجیے۔"

"اپنے لڑکے کو باہر منشی کے کمرے میں بٹھا دو۔"

فیروزہ نے اپنے لڑکے سے کہا "سلیم میاں تم باہر بیٹھ جاؤ۔"

جب سلیم چلا گیا فیروزہ نے برقعہ اُتار دیا۔ اُس نے پتلی سی شلوار اور قمیض پہن رکھی تھی جس سے اُس کے جسم کے خط وخال صاف نظر آتے تھے۔ دیکھنے کے بعد ہاشمی نے کہا "ٹھیک ہے اگلے بدھ وار کو آ جانا۔ تب تک تمھارا مقدمہ تیار رکھوں گا۔ ہو سکے تو کچھ رقم لیتی آنا۔"

اگلی بار جب فیروزہ آئی مقدمہ تو تیار تھا۔ مگر ہاشمی نے معاملہ کو طول دیتے ہوئے کہا "پچھلی بار تم شاید کہہ رہی تھیں کہ رحیم نے تمھارے پستان ناخون سے کُریدے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو نشان تو ہونے چاہئیں۔"

فیروزہ جانتی تھی اگر اُس نے ٹال مٹول کی تو ہاشمی پھر پیسوں کی بات کرے گا۔ اُس نے سلیم کو باہر منشی کے پاس بھیج دیا۔ برقعہ اُتار کر چولی کے بٹن کھول دِیے۔ جب ہاشمی نے ہاتھ لگا کر ٹٹولنا چاہا وہ کہنے لگی "آپ مزے بھی لیں گے اور ساتھ میں فیس بھی۔"

ہاشمی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "کون کم بخت پیسوں کی بات کر رہا ہے۔"

فیروزہ نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا "تو کیا سمجھوں؟ حساب چکتا ہو گیا۔"

ہاشمی نے پھر مسکراتے ہوئے کہا "ایسا ہی سمجھو۔"

آدھ گھنٹے بعد جب فیروزہ جانے لگی تو ہاشمی نے اُس کو تسلی دیتے ہوئے کہا "کل ہی تمھارا مقدمہ دائر کر دوں گا۔ کوشش کروں گا جلدی کی تاریخ مل جائے۔ آتے جاتے بیچ میں دریافت کر لینا۔"

اپنے مؤکل رحیم خان کے کہنے پر عدالت میں مدعاعلیہ کے وکیل نے اُلٹا فیروزہ پر الزام لگایا کہ وہ بدچلن عورت تھی، مگر کیونکہ اُس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا عدالت نے اس الزام کو بے بنیاد بتاتے ہوئے ردّ کر دیا۔ مگر عدالت نے فیروزہ کو ڈاکٹری معائنہ کروانے کا حکم دیا اور مقدمہ ڈاکٹری رپورٹ کے آنے تک ملتوی کر دیا۔

عدالت کا حکم سن کر فیروزہ گھبرائی۔ ہاشمی نے اُسے سمجھایا ’’تم فکر مت کرو، میں ڈاکٹر کو جانتا ہوں۔ میرے منشی کے ساتھ چلی جانا۔ وہ تمھاری جانچ کروا کے رپورٹ بنوا لے گا۔‘‘

فیروزہ نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا ’’مگر ڈاکٹر تو فیس مانگے گا۔‘‘

’’تم فکر مت کرو، میں نپٹ لوں گا۔ وہ تم سے کچھ نہیں مانگے گا۔‘‘

جب رپورٹ اگلی پیشی پر عدالت کے سامنے رکھی گئی تو عدالت نے اُسے جھٹ قبول کر لیا۔ پھر وکیلوں کی بحث ہوئی۔ آخر میں عدالت نے فیصلہ فیروزہ کے حق میں سنایا۔ اسے طلاق مل گیا اور ساتھ میں سلیم کی نگرانی بھی۔ طلاق ملتے ہی فیروزہ رحیم خان کا گھر چھوڑ کر اپنے والدین کے ساتھ باڑہ ہندو راؤ میں رہنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کے ابّو نے کہا ’’بیٹی، تمھارا دوسرا نکاح تو کرنا ہی پڑے گا۔ میں نے قاضی سے بات کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا عدالت کے فیصلہ یعنی طلاق نامہ کی نقل چاہیے۔ مشتاق احمد کے پاس چلی جاؤ۔ تمھیں نقل دلوا دے گا۔ نقل دلوانا اُس کا فرض تھا۔ نہ جانے اُس نے کیوں نہیں دی۔‘‘

فیروزہ کے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگلے دن وہ ہاشمی کے دفتر گئی اور نقل کی بات کی۔

ہاشمی نے کہا ’’نقل نکلوانے کے لیے کچھ خرچہ ہوگا۔‘‘

فیروزہ نے جھنجھلاتے ہوئے کہا ’’آپ کو فیس تو پوری مل چکی ہے۔ اب بھی کوئی کسر رہ گئی ہے۔‘‘

’’فیروزہ بیگم، بگڑو نہیں۔ بگڑنا صحت کے لیے اچھا نہیں۔ خرچہ میں کر دوں گا۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔‘‘ ہاشمی نے شیریں آواز سے کہا۔

فیروزہ ٹھنڈی پڑ گئی۔ کہنے لگی ’’آپ کیوں کریں گے خرچہ، جو لینا ہے لے لیجیے۔ ایک بار آپ نے صندوق سے نکال لیا دوبارہ بھی نکال لیجیے۔ کیا فرق پڑتا ہے۔‘‘

آدھ گھنٹہ بعد جب فیروزہ جانے لگی تو ہاشمی نے کہا ’’اگلے بدھ کی شام کو نقل لے جانا۔ اگر میں دفتر میں نہ ہوں میرے منشی سے لے لینا۔ اُس کے پاس چھوڑ دوں گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اب گھر جا کر آرام کرو۔‘‘

اگلے بدھ کو جب فیروزہ نقل لینے آئی تو منشی نے اُسے اندر جانے سے روک دیا اور کہا "نقل میرے پاس ہے۔ لے جاؤ۔"

"کیا وکیل صاحب دفتر میں نہیں ہیں؟"

"ہیں، مگر مصروف ہیں۔" منشی نے روکھا جواب دیا۔

"کوئی نئی خاتون آئی ہے کیا طلاق کا مقدمہ ڈلوانے کے لیے۔" فیروزہ نے تلخی سے پوچھا۔

نند گوپال نے مسکراتے ہوئے کہا "محترمہ، ایسا ہی سمجھو۔"

فیروزہ نے نقل لی اور بڑبڑاتے ہوئے چلی گئی۔ جہاں تک نند گوپال کو سنائی دیا وہ کہہ رہی تھی "حرامی کہیں کا، عورتوں کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔"

○○

نچلی سطح کی صفائی

جب شکتی گڑھ کے مہاراج بھدربل کھتری نے اپنا خاص سفیر بھیج کر اپنے شہزادے سوریہ پرکاش کھتری کے لیے لوہ گڑھ کے مہاراج تیج ونت سنگھ راٹھور سے اس کی شہزادی چندامکھی کا ہاتھ مانگا تو اُس نے انکار کردیا۔ لوہ گڑھ کے مقابلے میں شکتی گڑھ ایک چھوٹی ریاست تھی۔ دوسو سال پہلے کوئی پچاس سال تک شکتی گڑھ لوہ گڑھ کی سرپرستی میں بھی رہ چکا تھا۔ مہاراجا راٹھور ویسے بھی کھتری کو اپنے سے ادنیٰ سمجھتا تھا۔ مشیرِ خاص کا استقبال کرتے ہوئے اُسے نہیں میں جواب دیا۔ کوئی وجہ نہیں بتائی۔

مہاراج کھتری تو شاید اس واقعے کو بھول جاتے مگر شہزادے نے اُسے اپنی توہین سمجھا۔ حقیقت مگر کچھ اور تھی۔ شہزادے نے ایک بار چندامکھی کو کہیں دیکھا تھا۔ تب سے وہ اُس کے حسن پر فریفتہ ہوگیا تھا اور اُسے دل سے نہیں نکال سکا تھا۔ جب اُسے یہ خبر ملی کی مہاراج راٹھور اپنی شہزادی کا رشتہ سندر گھڑھ کے شہزادہ شور بیر سنگھ سے کرنے جارہا ہے تو اُسے غصہ آیا۔ اُس نے بھوانی ماں کی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ کر قسم کھائی کہ وہ ہر حالت میں چندامکھی کو حاصل کرکے رہے گا۔

چندامکھی جیسا کہ اُس کا نام تھا اُس کا چہرہ اتنا تاباں تھا جیسے وہ شب چاردہم کا چاند ہو۔ جو بھی اُسے ایک بار دیکھتا اُسے حسرت ہوتی کہ وہ اسے ساری زندگی دیکھتا رہے۔ مہاراج تیج ونت سنگھ اور مہارانی ستارہ دیوی کی واحد اولاد ہونے کی وجہ سے شہزادی کو دنیا کی

سب آسائشیں میسر تھیں۔ جس دن سے وہ پیدا ہوئی اُس کی پرورش کے لیے کئی خادمائیں مقرر کردی گئیں۔ امبیکا اُن سب خادماؤں کی سربراہ تھی۔ شہزادی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور اُس کی تربیت میں کوئی کسر نہ رہ جائے یہ سب امبیکا کی ذمّے داری تھی۔ رات کو جب ساری خادمائیں چھٹی کر کے چلی جاتیں صرف امبیکا شہزادی کے ساتھ رہتی تھی اور شہزادی کے کمرے میں ہی سوتی تھی۔

جب شہزادی چھوٹی سی تھی اُسے یہ سمجھ نہیں تھی کہ کون سی خادمہ اُسے نہلا رہی ہے اور کون کھانا کھلا رہی ہے۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اُس کا امبیکا کے ساتھ لگاؤ زیادہ ہو گیا۔ چاہتی تو وہ یہی تھی کہ اُس کے سارے کام امبیکا کرے مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ ایک بات پر وہ اَڑ گئی کہ رفعِ حاجت کے بعد اُس کی نچلی سطح کی صفائی امبیکا ہی کرے گی اور نہلائے گی بھی وہی۔

جب شہزادی پانچ سال کی ہونے کو آئی تو ایک دن امبیکا نے اُس سے کہا ''شہزادی صاحبہ، اب آپ بڑی ہو گئی ہیں۔ نیچے کی صفائی اب آپ کو خود کرنی چاہیے۔''

وہ کہاں سننے والی تھی۔ بچپنا تھا۔ امبیکا نے مہارانی سے کہا۔ اُس نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا ''کوئی فکر کی بات نہیں۔ آہستہ آہستہ اپنا کام سیکھ جائے گی۔ میرے ماں باپ مجھے بتاتے تھے کہ میں بھی ایسی ہی تھی، مگر آہستہ آہستہ میں اپنے آپ غسل خانے جانے لگ گئی۔''

مگر شہزادی کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ وہ اپنے آپ کپڑے بدلنے اور کھانا کھانے تو لگ گئی مگر نچلی سطح کی صفائی وہ اب بھی خود نہیں کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی رٹ لگاتی رہتی ''میرے ہاتھ گندے ہو جائیں گے۔ مجھے بدبو آتی ہے'' اسے کئی بار سمجھایا گیا کہ خوشبودار صابون سے اپنے ہاتھ اچھی طرح دھو لیا کرو کوئی بدبو نہیں آئے گی۔ وہ پھر بھی نہیں مانی۔ ایک بار جب امبیکا تین دن کے لیے بیمار پڑ گئی، شہزادی پاخانہ گھر گئی ہی نہیں۔

اب شہزادی تیرہ سال کی ہو گئی تھی۔ ایک صبح جب امبیکا اُس کی صفائی کر رہی تھی تو

شہزادی کو ایک عجیب طرح کا اشتیاق ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب امبیکا صفائی کر کے ہٹی تو شہزادی نے کہا "اچھی طرح سے کرو۔ مجھے ابھی بھی بد بو آ رہی ہے۔ ذرا اور رگڑو۔"

امبیکا مسکراتے ہوئے بولی "شہزادی جی، صفائی تو میں نے ویسے ہی کی ہے جیسے روزانہ کرتی ہوں۔ اب آپ جوان ہو گئی ہیں۔ جیسی صفائی اب آپ چاہتی ہیں وہ تو کوئی شہزادہ ہی کرے گا۔"

شہزادی نے ڈانٹتے ہوئے کہا "شہزادہ جب کرے گا دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تم کرو۔"

امبیکا کو شہزادی کا کہنا اچھا نہیں لگا۔ اُس نے مہارانی سے جا کر کہا "مہارانی صاحبہ، آپ شہزادی کو سمجھائیے۔ اپنی صفائی خود کیا کریں۔ ایسا کب تک چلے گا۔ جب شادی ہو جائے گی تو کیا ہو گا؟"

مہارانی نے مہاراجا سے ذکر کیا۔ مہاراج اپنی داڑھی کو کھجلانے لگے۔ جب کھجلاتے کھجلاتے ایک بال ہاتھ میں آیا تو وہ کہنے لگے "معاملہ تو کافی سنجیدہ ہے۔ کوئی نہ کوئی علاج تو کرنا ہی پڑے گا۔ مگر صلاح کی جائے تو کس سے؟"

جب شہزادی کی شادی کی بات پکّی ہو گئی تو مہاراجا اور مہارانی کو فکر ہوئی کہ سسرال میں شہزادی کی نچلی سطح کی صفائی کون کرے گا۔ مہارانی کے مشورے پر مہاراج نے جہیز میں امبیکا کو ملا کر دس خادماؤں کی پیشکش کی، جو جہیز میں دی جانی والی دوسری اشیا سے الگ تھیں، مگر شہزادہ شورویر نہیں مانا۔

شہزادہ حال ہی میں لندن سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا۔ وہ موجودہ اور نئے خیالات والا تھا۔ خادمائیں تو ایک طرف وہ کسی طرح کا جہیز لینے کے حق میں نہیں تھا۔ مہاراج راٹھور کے بار بار گذارش اور اصرار کرنے پر شورویر سنگھ صرف امبیکا کو لینے پر مان گیا، وہ بھی اس شرط پر کہ تین مہینے کے بعد امبیکا کو واپس بھیج دیا جائے گا۔

شہزادی کی شادی شورویر سنگھ سے ہو گئی۔ اُس کی صفائی ابھی بھی امبیکا کرتی تھی۔ اس بات کا علم سسرال میں کسی کو نہیں تھا۔ جیوں جیوں وقت گزرتا گیا اور تین مہینے پورے ہونے

میں کچھ دن ہی باقی رہ گئے تھے۔ رانی چندا مکھی کی تشویش بڑھتی گئی۔ امبیکا کے جانے کے بعد اُس کی صفائی کون کرے گا۔ معاملہ اتنا پیچیدہ تھا کہ چندا مکھی اسے کسی اور خادمہ کے سپرد نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر اس کی ذرا سی بھی بھنک سسرال والوں کو لگ گئی تو وہ اُس کا مذاق اُڑائیں گے اور بات پھیل جائے گی جو اُس کے لیے شرمندگی کا باعث بن جائے گی۔

جب تین مہینے میں صرف چھ دن رہ گئے تھے ایک ہیبت ناک حادثہ ہوا۔ شہزادہ سوریہ پرکاش کھتری نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر ایک رات چپکے سے سندر گڑھ پر دھاوا بول دیا۔ حالانکہ مہاراجا بھدر بل نے اپنے لڑکوں کی منصوبے کی مذمت کی اور اُنھیں اِس بیہودہ حرکت سے روکنے کی پوری کوشش کی مگر انھوں نے اپنے والد کی ایک بھی نہ سنی۔ کافی دیر تک گھمسان کی لڑائی ہوتی رہی۔ آخر میں سوریہ پرکاش چندا مکھی کو اِغوا کرنے میں کامیاب رہا۔ وہ اُسے بھگا کر لے گیا۔ اس اثنا میں لوہ گڑھ سے بھی کچھ فوج آ گئی۔ فوج کے ایک دستے نے سوریہ پرکاش کا پیچھا کیا۔ اُس نے اپنا گھوڑا اور تیز دوڑایا۔ مگر پہاڑی راستہ ہونے کی وجہ سے گھوڑے کا پاؤں پھسل گیا۔ سوریہ پرکاش اور چندا مکھی دونوں گھوڑے سے گر پڑے۔ شہزادے کا سر ایک بہت بڑے پتھر سے جا کر ٹکرایا اور اُس کی اُسی وقت موت ہو گئی۔

چندا مکھی کو کوئی خاص چوٹ نہیں لگی تھی، مگر وہ دہشت زدہ تھی۔ وہ وہاں سے بھاگی مگر بھوک، پیاس اور تھکاوٹ کی وجہ سے وہ زیادہ دُور نہیں بھاگ سکی۔ آخر میں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ فوجی دستہ نے جب سوریہ پرکاش کی لاش اور زخمی گھوڑے کو دیکھا تو اُنھیں چندا مکھی کی فکر ہوئی۔ اُنھوں نے اُس کی بہت تلاش کی مگر وہ اُنھیں نہیں ملی۔ جہاں چندا مکھی گری تھی وہ جگہ بدقسمتی سے اُن کی نظر سے چوک گئی۔

جب چندا مکھی کی آنکھ کھلی اُس نے اپنے آپ کو ایک معمولی سی کھاٹ پر لیٹے ہوئے پایا۔ اُس کا تکیہ اور اوپر اوڑھنے والی چادر دونوں بہت میلے تھے اور کمرے میں کچھ بدبو بھی آ رہی تھی۔ وہ گھبرا کر چلائی۔ باہر سے ایک عورت جس نے میلے کچیلے اور پھٹے ہوئے کپڑے

پہن رکھے تھے بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اس نے چندا لکھی سے کو کہا '' فکر مت کرو۔ جب ہم تمھیں اُٹھا کر یہاں لائے تو تم بے ہوش تھیں۔ پھر اُس نے پوچھا '' جس طرح کی پوشاک تم نے پہن رکھی ہے اُس سے تو تم کوئی شہزادی لگتی ہو مگر حقیقت میں ہو کون؟''

خوف کی وجہ سے جب چندا لکھی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ عورت اپنی پڑوسن سے کہنے لگی۔ '' لگتا ہے جسمانی چوٹ کے ساتھ ساتھ دماغی چوٹ بھی لگی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے۔''

پڑوسن نے کہا '' رابڑی بہن، اس کی یہ بری حالت دیکھ کر مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ پر یہ سن تو لیتی ہو گی اور شاید بول بھی سکتی ہے۔''

چندا لکھی نے سوچا '' خدا جانے، یہ لوگ میرے خیر خواہ ہیں یا میرے دُشمن۔ اچھا یہی ہو گا میں انھیں اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتاؤں۔ جب تک مجھے پورا یقین نہ ہو جائے کہ یہ میرے ہمدرد ہیں، چپ رہنے میں ہی میری بھلائی ہے۔ جب وہ بُت کی طرح چپ کر کے بیٹھی رہی اُن دونوں کو یقین ہو گیا کہ وہ گونگی بھی ہے اور بہری بھی۔

چندا لکھی یہ تو بخوبی سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ نچلے طبقے کے ہیں۔ وہ مجبور تھی۔ اُسے جو ملا وہی کھانا پڑا، چاہے کھانا اُس کے گلے سے نیچے مشکل سے اُترتا تھا۔ اُسی طرح اُسے پرانی کھاٹ پر میلے بستر کے اوپر سونا پڑا۔ ساتھ ساتھ کمرے کی بدبو بھی برداشت کرنی پڑی۔

نچلی سطح کی صفائی کون کرے گا۔ اس خوف سے چندا چار دن رفعِ حاجت کے لیے نہیں گئی، مگر اندر کی گندگی کو وہ ہمیشہ کے لیے نہیں روک سکتی تھی۔ جب اُس سے اور برداشت نہ ہوا تو اشارے سے اُس نے رابڑی سے پوچھا کہ جائے حاجت کہاں ہے۔ رابڑی نے اُسے اشاروں سے سمجھایا 'سامنے کھلے میدان میں چلی جاؤ۔ صاف ستھری جگہ دیکھ کر بیٹھ جانا۔ نچلی سطح صاف کرنے کے لیے پانی کا لوٹا ساتھ لے جاؤ۔ واپس آ کر ہاتھ مٹی سے اچھی طرح سے دو تین بار دھو لینا'

چندا لکھی سے روکا نہیں جا رہا تھا۔ اُس نے فوراً لوٹا اُٹھایا اور میدان کی طرف بھاگی۔

گندگی نکل جانے پر اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے ہاتھوں سے صفائی کی۔ صفائی کرتے کرتے وہ رونے لگی۔ لوٹے کے سارے پانی کا استعمال کر کے بھی اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سطح کی صفائی ابھی پوری طرح سے نہیں ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ اُسے یہ بھی لگا کہ کمرے میں آنے والی بدبو اُس کے پاخانے کی بدبو سے کافی حد تک ملتی تھی۔

ہر صبح کوئی چھ بجے بستی کے سبھی مرد اور عورتیں جن میں دس سال سے اوپر کے لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل تھیں جھاڑو اور ٹوکری اُٹھا کر نزدیک کے شہر میں صفائی کرنے اور ٹٹّی اُٹھانے جاتے تھے اور اپنا کام پورا کر کے دوپہر کو گھر لوٹتے تھے۔ ایک دن اشارے سے رابڑی نے چندامکھی کا نام پوچھنے کی پھر کوشش کی مگر اُس نے کوئی علامت نہیں دی۔ جب رابڑی کو خیال آیا کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی ہے، تو اُسے مخاطب کرتے ہوئے اپنے آپ بولنے لگی ''تمھارا کوئی نام تو ضرور ہوگا۔ کیونکہ تم خوبصورت ہو میرے خیال میں تمھارا نام چندا ہونا چاہیے۔'' تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگی ''تمھارے ماں باپ کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں تمھاری شادی اپنے چھوٹے بھائی سے کرادوں گی۔ وہ آٹھ جماعت تک پڑھا ہوا ہے اور ایک سرکاری دفتر میں ابھی ابھی چپڑاسی لگا ہے۔ کافی ہوشیار ہے۔ چاہے وہ تمھاری طرح گورا چٹا تو نہیں مگر پھر بھی دیکھنے میں اچھا ہے۔ تمھاری اور اُس کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔'' چندا سب کچھ سن رہی تھی مگر اُس نے کسی طرح کا کوئی اشارہ نہیں کیا ورنہ بھانڈا پھوٹ جاتا۔ وہ اندر ہی اندر خوف سے کانپنے لگی۔

جب رابڑی نے یہ کہا ''جب تک تمھاری شادی نہیں ہو جاتی تم ہمارے ساتھ شہر میں کام کیا کرو۔ کام مشکل نہیں ہے۔ دو چار دن میں سیکھ جاؤ گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟ گھر بیٹھے بیٹھے بھی کیا کرو گی۔ جب تک تمھارے نئے کپڑے نہیں سل جاتے تم میرے پہن لیا کرو۔ فٹ آجائیں گے۔''

اگلے دن جب رابڑی نے چندا کو ساتھ چلنے کے لیے اشارہ کیا تو اُس نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا کہ اُس کے پیٹ میں درد ہے۔ رابڑی اُس کو گھر پر چھوڑ کر اپنے کام

سے شہر چلی گئی۔ جب وہ دو بجے کے قریب واپس آئی تو چندامکھی گھر پر نہیں تھی۔ وہ اُس کی غیر موجودگی میں بھاگ گئی تھی۔ رابڑی کہنے لگی "جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔ بے وقوف ہے۔ کسی ایرے غیرے کے ہتھے چڑھ تو زندگی برباد ہو جائے گی۔" رابڑی نے اُسے ڈھونڈنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

چندامکھی وہاں سے بھاگتے بھاگتے ایک کھیت میں پہنچ گئی۔ کسی کسان نے اُسے پکڑ لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ رانی چندامکھی لاپتہ تھی۔ اُسے ڈھونڈنے والے یا اُس کی اطلاع دینے والے کے لیے سندرگڑھ کے مہاراجا نے ایک لاکھ روپیہ دینے کا اعلان کیا تھا۔ اُسے لگا کہ وہی چندامکھی تھی۔ مگر اُس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اُسے ڈر تھا کہیں پوچھ تاچھ کرنے پر وہ موقع دیکھ کر بھاگ نہ جائے۔ اُسے کھانا کھلایا اور رات کو سونے کے لیے صاف ستھرا بستر دیا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے اپنی بیوی کو اس کا خیال رکھنے کو کہا اور سیدھا سندرگڑھ ریاست کی طرف چل پڑا۔ اس نے مہارج کو اُس لڑکی کا حلیہ بتایا جو اُس کے گھر پر تھی۔ یہ خبر سنتے ہی شہزادہ شورویر سنگھ فوج کا ایک دستہ لے کر کسان کے ساتھ اُس کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی شہزادے نے چندامکھی کو پہچان لیا اور اُسے فوراً محل میں لے آیا۔ چندامکھی نے راحت کی سانس لی مگر نہ ہی شہزادہ یا اُس کے ماں باپ نے چندا سے اُس وقت کچھ پوچھنا مناسب سمجھا اور نہ ہی چندا نے کچھ بتایا۔ رانی کے صحیح سلامت واپس آنے پر سارے سندرگڑھ میں جشن منایا گیا۔ اعلان کے مطابق مہاراج نے کسان کو ایک لاکھ روپیہ نقد دیا۔ محل میں ایک بار پھر شادمانی کا ماحول قائم ہو گیا۔

امبیکا کو آئے ہوئے تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ وعدے کے مطابق اُسے اب تک واپس چلے جانا چاہیے تھا۔ مگر جو حادثہ ہوا اُس کی وجہ سے امبیکا کو روک لیا گیا۔ اپنی ہمدردی اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے شہزادے نے چندامکھی سے کہا "اگر تم چاہو تو امبیکا کو ہمیشہ کے لیے یہاں رکھ لیتے ہیں۔ چندامکھی نے فوراً جواب دیا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" امبیکا پاس کھڑی سن رہی تھی۔ اُس نے شہزادے کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ کہنا چاہا

تو چندا نے کہا ''امبیکا دیوی، اب تم جاؤ، پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔اب میں اپنا کام خود کرلوں گی۔''

امبیکا لوہ گڑھ واپس چلی گئی۔اُس نے جانے سے پہلے چندا مکھی سے یہ پوچھنے کی بہت کوشش کی کہ اُس کے اندر یہ بتدیلی کیسے آئی تھی مگر چندا مکھی نے راز کو راز رکھا یہاں تک کہ اُس نے اپنے ماں باپ کو بھی نہیں بتایا۔امبیکا یہ سوچ کر اُس کرشمہ کو بھول گئی کہ شاید یہ سب تبدیلی دیوی بھوانی ماں کی مہربانی سے ہوئی۔

OO

اضطراب

مہرا صاحب، آداب بجالاتا ہوں۔ میں چترویدی بول رہا ہوں۔ امید ہے میرا کاغذ تیار ہوگا۔"

"آپ کا ہی کام کر رہا ہوں۔ ایک دو گھنٹے میں مکمل ہو جائے گا۔" مہرا نے ٹیلی فون پر جواب دیا۔

"آج ہو جائے گا نا؟" مہرا نے عاجزی سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، آج ہی ہو جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" مہرا نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔

"تو میں کب لینے آؤں؟"

"تین بجے کے بعد کبھی بھی آسکتے ہیں آپ۔"

"آپ کب تک دفتر میں رہیں گے؟"

"میں چھ بجے سے پہلے نہیں جاؤں گا۔"

"اگر میں خود نہ آسکوں تو اپنے کسی آدمی کو بھیج دوں۔"

"ہاں ہاں، کسی کو بھیج دینا۔ میں نیچے ریسپشن میں کہہ دوں گا۔ مگر آپ جسے بھی بھیجیں اُسے اپنا اختیار نامہ دے دینا۔"

"ٹھیک ہے مہرا صاحب شکریہ۔"

رام موہن مہرا انکم ٹیکس محکمہ میں ڈائریکٹر لگا ہوا تھا اور جینت کمار چترویدی ایک چھوٹے

سے کارخانے کا مالک تھا۔ اُس کی اوکھلا میں کاسمیٹک بنانے کی فیکٹری تھی۔ اُسے بینک سے قرض لینے کے لیے انکم ٹیکس محکمہ سے ایک سرٹیفکیٹ چاہیے تھا کہ اُس نے سرکار کو کوئی ٹیکس نہیں دینا ہے اور نہ ہی اُس کے خلاف کوئی معاملہ زیرِ غور ہے۔ اسی کاغذ کے لیے اس نے مہرا کو ٹیلی فون کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دفتری کام کی وجہ سے جانتے تھے۔ کئی بار چترویدی مہرا کے دفتر اُس سے ملنے آتا تھا۔ جب کبھی اُسے کام پڑتا وہ مہرا کی خدمت ضرور کرتا۔ بغیر خدمت کیے دفتر سے فائل نکلوانا لگ بھگ ناممکن تھا، یہ مہرا اچھی طرح سے جانتا تھا۔ ابھی تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ چترویدی نے ایک بار پھر مہرا کو فون کیا "معاف کیجیے گا مہرا صاحب آپ کو پھر پریشان کر رہا ہوں۔ میرا......"

مہرا نے بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ کا کاغذ تیار ہے۔ آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔"

"شکریہ! ایسا ہے مہرا صاحب میری بیوی شوبھا کالکا جی جارہی ہے۔ راستے میں آپ سے کاغذ لے لے گی۔"

"ٹھیک ہے اُنھیں دے دوں گا۔ میں نیچے ریسیپشن میں بول دیتا ہوں۔" مہرا نے جواب دیا۔

چار بجے کے لگ بھگ ریسیپشن سے مہرا کو فون آیا۔ "جناب کوئی محترمہ شوبھا چترویدی آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔"

"اُنھیں اوپر میرے کمرے میں بھیج دو۔" مہرا نے کہا۔

مہرا کی شوبھا سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب اُس نے مہرا کے کمرے کے اندر پاؤں رکھا وہ اُسے دیکھتے ہی کچھ لمحوں کے لیے دم بخود ہو گیا۔ ایسی حسین عورت اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ گلِ گلاب جیسا دمکتا چہرہ، لمبی چکنی ناک، ہرنی جیسی آنکھیں، زرد چمکتے ہوئے ہونٹ، بھرا ہوا جسم اور قد پانچ فٹ نو انچ۔ اُسے ایسا لگا جیسے اِندر لوک کی مینکا بہشت سے اُتر کر اُس کے دفتر میں آگئی ہو۔ شوبھا نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کی جس کا جواب مہرا نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمستے میں دیا۔ پھر اُس نے شوبھا کو باعزت کرسی پر بٹھایا اور چپراسی کو پانی

لانے کے لیے کہا۔ جب شوبھا اپنے بٹوے سے اختیار نامہ نکال کر مہرا کو دینے لگی تو اُس نے کہا" رہنے دیجیے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

سرٹیفکیٹ تو تیار تھا۔ مگر شوبھا کو دیکھ کر مہرا کا جی نہیں بھرا۔ اُس نے سوچا اگر میں نے کاغذ دے دیا تو وہ فوراً وہاں سے چلی جائے گی۔ وہ اُسے کچھ دیر کے لیے اپنے سامنے بیٹھا ہوا اور دیکھنا چاہتا تھا۔ دفتر کی الماری کھول کر وہ فائیلوں اور کاغذوں کو ٹٹولنے لگا جیسے وہ سرٹیفکیٹ ڈھونڈ رہا ہو۔ ہر ایک دو منٹ کے بعد وہ اپنی نظر شوبھا پر ڈالتا۔ کبھی کہتا" نہ جانے میں نے کہاں رکھ دیا، مل جائے گا۔" کبھی کہتا" مجھے افسوس ہے۔ آپ کو خواہ مخواہ انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔" ایک بار اُس نے پوچھا۔" آپ کے لیے چائے منگواؤں۔"

شوبھا نے جواب دیا" آپ کا شکریہ! میں چائے نہیں پیتی۔"

جب مہرا نے دیکھا کہ پانی کا گلاس ویسے کا ویسا پڑا تھا اُس نے مسکرا کر کہا" آپ پانی بھی نہیں پیتیں۔"

شوبھا نے جواب دیا" جی مجھے پیاس نہیں ہے۔"

کاغذ ڈھونڈنے کے بہانے سے مہرا نے بیس منٹ لگا دیے۔ اتنی دیر شوبھا چپ چاپ کرسی پر بیٹھی رہی۔ جب آخر میں مہرہ اُسے سرٹیفکیٹ دینے لگا اُس کے منہ سے خود بخود یہ الفاظ نکلے" آپ بہت خوبصورت ہیں۔" شوبھا کچھ نہیں بولی جیسے اُس نے سنا ہی نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر نہ تبسّم تھا اور نہ ہی غصّے یا گھبراہٹ کی کوئی علامت تھی۔ جب شوبھا اُٹھ کر جانے لگی، مہرا نے کہا" چلیے میں آپکو نیچے گیٹ تک چھوڑ دیتا ہوں۔"

شوبھا نے ہاں یا نہیں میں کچھ نہیں کہا۔ مہرا نے اس سے گفتگو کرنے کے لیے اسے بہت آمادہ کیا مگر شوبھا نے کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ شوبھا کو چھوڑ کر جب وہ واپس اپنے کمرے میں آیا اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا جسم اندر اندر جل رہا ہو۔ آگ تو لگ ہی چکی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے پانی کے چار گلاس پی گیا۔ مہرا کے لیے اب مشکل یہ کھڑی ہو گئی کہ وہ آگ کب بجھے گی یا وہ ہمیشہ اُس میں جلتا رہے گا۔ یہ تو وقت ہی بتا سکتا تھا، مگر وقت سے کون پوچھے۔ وہ

تو کہیں ملتا ہی نہیں۔

حسن نہ کسی ایک شخص کی جائیداد ہے اور نہ ہی کسی کا اُس پر حق ہے۔ حسن وہی جو آنکھوں میں سما جائے۔ حقیقت میں رام موہن نے کئی خوبصورت عورتیں دیکھی ہوں گی مگر شوبھا نے اُس کا دل موہ لیا۔ اس لیے اُس کو گمان ہوا کہ اُس نے شوبھا جیسی خوبصورت عورت پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ شوبھا سے ملنے سے پہلے جب کبھی اُس نے کسی مہ جبیں کو دیکھا کام دیو سو رہا تھا۔ مگر جب اُس نے شوبھا کو دیکھا کام دیو جاگ رہا تھا۔ اُس نے جھٹ اپنے ترکش سے تیر نکالا اور چلا دیا۔ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ گیا جس نے مہرہ کے دل کو گھائل کر دیا۔ جب اُس نے دوسرا تیر شوبھا پر چھوڑنے کا سوچا تو ترکش خالی تھا۔ بعد میں یا تو وہ بھول گیا یا کسی اور کام میں مصروف ہو گیا۔

مہرا شادی شدہ تھا۔ بیوی کے علاوہ دو بچّے تھے۔ پینتالیس سال کی عمر میں عشق کرنا شاید اُس کی نیت نہیں تھی۔ اب اس کا دل نہ دفتر کے کام میں لگتا تھا اور نہ ہی گھر پر۔ جس بیوی اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر وہ کھانا کھاتا تھا، باتیں کرتا تھا، ہنستا اور کھیلتا تھا اب وہ اُس کو اچھے نہیں لگتے تھے۔ ایک دوبار اُس کی بیوی نے پوچھا بھی "کیا بات ہے؟ آج کل آپ چپ چاپ رہتے ہیں۔ کھانا کھا کر بستر میں گھُس جاتے ہیں۔ کوئی بات تو ہے۔"

مہرا نے ٹالتے ہوئے کہا "ایسی کوئی بات نہیں، دفتر میں آج کل کام بہت ہے۔ تھک جاتا ہوں۔"

رام موہن دن رات یہی سوچتا رہتا کہ شوبھا سے کیسے ملا جائے۔ اُسے کوئی راستہ دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر ایک دن دفتر میں چترویدی کا فون آیا۔ "مہرا صاحب، آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ کے سرٹیفکیٹ سے ہمارا کام جلدی ہو گیا۔ اس خوشی میں میں آپ کو ہوٹل میں دعوت دینا چاہتا ہوں۔ بتایئے، آپ کب آسکتے ہیں؟"

"چھوڑیے چترویدی صاحب، آپ کا کام ہو گیا خوشی کی بات ہے۔" مہرا نے ٹالتے

ہوئے جواب دیا۔

''مہرا صاحب، انکار کر کے ہمیں مایوس مت کیجیے۔ ہم آپ کو دل سے بلا رہے ہیں۔''
چترویدی نے عاجزی کے ساتھ کہا۔

''آپ تو جانتے ہیں ہم سرکاری ملازم ہیں۔ باہر کھانا نہیں کھاتے۔ کیونکہ آپ دل سے بلا رہے ہیں، ہم کسی دن آپ کے گھر آ جائیں گے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ آپ کی بیوی سے شوبھا کی بھی جان پہچان ہو جائے گی۔ میں گھر جا کر شوبھا سے بات کروں گا۔''

اگلے دن چترویدی کا پھر فون آیا ''اگر آپ اس سنیچروار کی شام کو خالی ہیں تو اپنی پتنی اور بچوں کو لے کر ہمارے گھر تشریف لے آیئے گا۔ کہیں تو میں اپنی گاڑی بھجوا دوں؟''

''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے گھر کا پتہ دے دیں ہم آ جائیں گے۔''
مہرا نے جواب دیا۔

جب چترویدی نے اپنے گھر کا پتہ بتایا تو مہرا نے چونک کر کہا ''آپ مالویہ نگر میں رہتے ہیں۔ آپ تو ہمارے گھر کے نزدیک ہیں۔''

''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''شیخ سرائے۔''

''ارے، کمال ہو گیا ہم ایک دوسرے کے اتنے نزدیک رہتے ہیں آج تک ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ جب آپ آئیں گے آپ سے بات چیت ہو گی۔'' چترویدی نے کہا۔

سنیچروار میں ابھی تین دن باقی تھے۔ مہرا خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ شوبھا سے کیا گفتگو ہو گی، وہ اسی کی دل ہی دل میں ریہرسل کرنے لگا:

'آپ کیسی ہیں؟' میں ہلکی مسکان سے پوچھوں گا۔

'میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں؟' شوبھا مسکرا کر جواب دے گی۔

'اُس دن آپ ہمارے دفتر تشریف لائیں، نہ آپ نے پانی پیا نہ چائے'۔

'جی اچھا نہیں تھا'۔

'اب آپ کیسی ہیں؟'

'آپ کو کیسی لگتی ہوں؟'

'آپ بہت اچھی لگتی ہیں'، تھوڑا رکنے کے بعد میں پھر کہوں گا' میں نے سوچا اُس دن دفتر میں میں نے آپ کو کچھ کہہ دیا آپ بُرا مان گئیں'۔

'بُرا کس بات کا؟ آپ نے ایسا کچھ نہیں کہا جو مجھے بُرا لگتا'۔

شوبھا میٹھی آواز سے جواب دے گی۔

'میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کیونکہ آپ نے میری تعریف کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خوبصورت شخص کو خوبصورت نہ کہا جائے تو یہ اُس کی بے عزّتی ہے۔' میں سنجیدگی سے کہوں گا۔

'آپ اتنی تعریف مت کیجیے ہماری۔' شوبھا دھیمی ہنسی کے ساتھ کہے گی۔

'آپ کبھی ہمارے گھر آیئے نا۔' میں اُسے بے تکلفی سے دعوت دوں گا۔

'ضرور آئیں گے۔ آپ بلائیں اور ہم نہ آئیں۔' شوبھا سچّے دل سے جواب دے گی۔

'آپ کے نزدیک رہتا ہوں۔ شیخ سرائے میں'۔

'یہ تو اور بھی اچھا ہے، تب تو آپ سے اکثر ملاقات ہوتی رہے گی'۔

اور بھی نہ جانے مہرا کے دماغ میں کتنے عجیب و غریب خیالات آئے جیسے وہ دن کو خواب دیکھ رہا ہو۔ شاید گھر کے کسی کونے میں اُسے شوبھا کو چھونے کا موقع مل جائے اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ایک آدھ بوسہ بھی ہو سکتا ہے۔ بیچ بیچ میں اُسے ڈر بھی لگتا شاید شوبھا اسے دیکھ کر اپنا منہ موڑ لے۔ وہ اتنی حسین تھی۔ نہ جانے اُس پر فدا ہونے والے کتنے لوگ ہوں گے۔ وہ مجھ ادھیڑ عمر کے آدمی سے کیوں آنکھ لڑائے گی۔ پھر اُس کا شوہر مالدار آدمی

ہے۔اُسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ چترویدی کے مقابلے میں ایک ادنیٰ سا سرکاری ملازم اُسے کیا دے سکتا ہوں۔

اب ہوا کیا۔ جو خیالی پلاؤ مہرا نے پکایا تھا وہ جل گیا۔ جس ناٹک کے لیے ریہرسل کرتا رہا وہ ناٹک ہوا ہی نہیں۔ چترویدی نے مہرا کے خاندان کے علاوہ چار اور خاندانوں کو بلا رکھا تھا۔ گھر میں لوگوں کی، جن میں بچے بھی شامل تھے، اتنی بھیڑ تھی جیسے مسافروں کی پلیٹ فارم پر ہوتی ہے۔ شوبھا سے ملاقات خالی دُعا سلام تک محدود رہی۔ نہ تو اُس کے چہرے پر کوئی مسکراہٹ تھی اور نہ ہی کوئی جذبہ۔ جس کمرے میں مہرا بیٹھا تھا وہاں شوبھا آئی تو کئی بار، کبھی کھانے پینے کا سامان رکھنے کے لیے اور کبھی اپنے شوہر سے کچھ پوچھنے کے لیے۔ اُس نے ایک بار بھی مہرا کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ مہرا کے چہرے پر پریشانی صاف دِکھائی دیتی تھی۔ اندر ہی اندر وہ غم کے آنسو پی رہا تھا۔ بنا پانی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا اس سے تو بہتر یہی ہوتا کہ وہ دعوت قبول ہی نہ کرتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد جب وہ گھر لوٹا، آتے ہی جا کر سو گیا۔ مگر نیند کہاں آنے والی تھی۔ ساری رات شوبھا کے خواب دیکھتا رہا۔

ہر روز بلا ناغہ مہرا صبح سیر کرنے جاتا تھا۔ جب اُسے چترویدی کے گھر کا پتہ مل گیا اُس نے سیر کا راستہ بدل لیا۔ اب اُس نے وہ راستہ پکڑا جو چترویدی کے گھر کے آگے سے جاتا تھا۔ اُس کو یہی اُمید رہتی کہ کسی دن شوبھا سے ملاقات ہو جائے گی۔ سردیوں کے دن تھے۔ عام طور پر لوگ گھروں کی کھڑکیاں بند رکھتے ہیں اور نہ ہی سویرے سویرے اپنے گھر کے آگے دِکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی پودوں کو پانی دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے مہرا کو شوبھا دِکھائی نہیں دی۔ مگر اُس نے اپنا راستہ نہیں بدلا۔ آخر سردی کا موسم کبھی تو ختم ہوگا ہی۔ دو مہینے کے بعد جب موسم میں کچھ تبدیلی آئی اُس کی اُمید پھر سے بندھ گئی۔ گھروں کی کھڑکیاں کھُلنے لگیں۔ لوگ صبح کو باہر نکلنے لگے۔ پودوں کو جلدی پانی ملنے لگا۔ سڑکوں پر آنے جانے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ سبزی اور پھل بیچنے والوں کی آواز سویرے سویرے سنائی دینے لگ گئی۔

جب کبھی مہرا کسی ریڑھی والے کو شوبھا کے گھر کے آگے یا نزدیک کھڑا ہوا دیکھتا وہ اپنے چلنے کی رفتار کم کر دیتا۔ شاید شوبھا اپنے گھر سے سبزی پھل لینے باہر آئے۔

ایک صبح مہرا نے شوبھا کو اپنے گھر کے آگے کھڑا دیکھا مگر اُس کی پیٹھ مہرا کی طرف تھی۔ وہ رُک گیا۔ شاید وہ پلٹ کر اُس کی طرف دیکھے تو وہ اُسے ہیلو کہہ سکے۔ مگر مہرا کے دیکھتے دیکھتے وہ اندر چلی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کا شوبھا سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر شوبھا کو پرنام کیا جس کا جواب شوبھا نے بھی اُسی طرح سے دیا۔ پھر وہ اُسے کہنے لگا

''آپ کیسی ہیں؟''

''میں ٹھیک ہوں'' شوبھا نے سیدھا سا جواب دیا جیسے مجبوری میں کہہ رہی ہو۔ مہرا اُمید کر رہا تھا کہ وہ بھی اُس سے پوچھے گی آپ کیسے ہیں، مگر اُس نے کچھ نہیں پوچھا۔ مہرا نے پھر کہا ''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔'' جب شوبھا نے کوئی جواب نہیں دیا تو مہرا نے کہا ''آپ شاید بھول گئی ہیں کہ آپ نے مجھے اپنے خاندان کے ساتھ دعوت پر بلایا تھا۔ آپ ایک بار سرٹیفکیٹ لینے کے لیے میرے دفتر بھی آئی تھیں۔''

''مجھے یاد ہے۔'' شوبھا نے مختصر جواب دیا۔

''چترویدی صاحب کیسے ہیں۔'' بات کو بدلتے ہوئے مہرا نے پوچھا۔

''ٹھیک ہیں۔'' شوبھا نے پھر مختصر جواب دیا۔ تھوڑا رکنے کے بعد کہنے لگی۔ ''معاف کیجیے، مجھے کچھ کام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔ یہ کیسی عورت ہے مہرا کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔ اُس کی تشویش اور بھی بڑھ گئی۔

مہرا نے سوچا کسی نجومی سے پوچھا جائے۔ نجومی نے اُس کا ہاتھ دیکھ کر کہا ''آپ اُسے بھول جائیں تو اچھا ہے۔''

''کوئی علاج؟'' مہرا نے مایوسی کے ساتھ پوچھا۔

''آپ اُسے اپنے آپ بھول جائیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' مہرا نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا۔ آپ کے عشق کی لکیر اُس کی قسمت کی لکیر سے اُلٹی طرف جا رہی ہے۔ کہیں بھی ملتی دِکھائی نہیں دیتی۔'' نجومی نے صاف طور پر بتایا۔

نجومی کے پیش گوئی سن کر مہرا کے دل کو ٹھیس لگی۔ وہ شوبھا کی مورتی کو دل کے مندر سے اُٹھا کر باہر کیسے پھینک سکتا تھا۔ یہ اُس کے بس کی بات نہیں تھی۔

ایک دن دفتر میں بیٹھے بیٹھے اُسے ایک تجویز سوجھی۔ کیوں نہ چترویدی اور شوبھا کو اپنے گھر کھانے پر بلایا جائے۔ کوئی سرکاری ملازم کسی کارخانے دار کو اپنے گھر کھانے کے لیے بلائے، اَڑوس پڑوس کے لوگ اس کا کیا مطلب نکالیں گے۔ اُسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ وہ سوچ ہی رہا تھا کہ چترویدی کو کب دعوت کے لیے مدعو کرے کہ ایک ایسا دردناک واقعہ ہوا جس نے عشقیہ ناٹک کے اسٹیج پر ایک دم پردہ گرا دیا۔ ناٹک اپنے اختتام تک پہنچا ہی نہیں۔

سنیچروار کا دن تھا۔ مہرا حسبِ معمول سیر کرتا ہوا چترویدی کے گھر کے آگے سے نکل رہا تھا، اُس نے کچھ لوگوں کو اُس کے گھر کے آگے کھڑے ہوئے دیکھا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ پڑوسی لگتے تھے کیونکہ انھوں نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو لوگ رات کو سوتے وقت پہنتے ہیں۔ اسے تعجب ہوا۔ اُس نے نزدیک جا کر ایک شخص سے پوچھا ''کیا بات ہے؟''

''چترویدی صاحب کی گھر والی اُس دنیا میں نہیں رہی۔'' اُس نے غم انگیز جواب دیا۔

مہرا نے گھبرا کر پوچھا ''کب؟''

''کل رات۔''

''مگر کیسے؟'' مہرا کا یہ سوال کرنا واجبی تھا۔

''وہ کافی عرصہ سے بیمار تھی۔''

اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا، کیا بیماری تھی پاس کھڑے ایک دوسرے شخص نے کہا

"کینسر کی بیمار تھیں۔"

یہ منحوس خبر سن کر مہرا کے دل کو چوٹ تو لگی ہی ساتھ ساتھ وہ حیرت زدہ بھی تھا۔ دیکھنے میں اتنی حسین اور تندرست اور اندر سے اتنی کھوکھلی ایک مُردے کے موافق۔ اس کے علاوہ قدرت نے اُس کے ساتھ کیا مذاق کیا۔ اُسے اُس عورت کے چکّر میں ڈال دیا جس کی زندگی کی لکیر چھوٹی تھی۔ اس حالت میں جب وہ وہاں آ ہی گیا تھا چترویدی سے ملنا اور ماتم پرسی کرنا ضروری تھا۔ وہ گھر کے اندر جانے لگا تو چترویدی اُسے دروازے میں ہی مل گیا۔ اُس نے شوبھا کی موت پر غم کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بڑے رنج کی بات ہے۔ میں ادھر سے سیر کرتا ہوا جا رہا تھا کہ کچھ لوگوں کو آپ کے گھر کے آگے جمع دیکھا۔ میں نے سوچا پوچھوں تو سہی کیا بات ہے۔"

"بھگوان کی یہی مرضی تھی۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بہت علاج کیا مگر آخر ہوا وہی جو تقدیر کی کتاب میں لکھا ہوا تھا۔" چترویدی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا میں شوبھا کو آخری بار دیکھ سکتا ہوں۔ میں اُنھیں خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔" مہرا نے دھیمی آواز میں کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ آپ میرے ساتھ آیئے۔" چترویدی نے جواب دیا۔

چترویدی مہرا کو کمرے کے اندر لے گیا جہاں شوبھا کا بدن فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ گردن سے نیچے کا حصّہ سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا مگر اس کا چہرہ کُھلا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں جیسے وہ بے فکری سے سو رہی ہو۔ سر کے کچھ بال بکھر کر اُس کے ماتھے اور شانوں پر لٹک رہے تھے۔ اُس کے ہونٹ اور رخساروں پر ابھی بھی وہی سُرخی تھی جو مہرا نے پہلی بار دیکھی تھی۔ مہرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جنھیں اُس نے بڑی مشکل سے ٹپکنے سے روکا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر شوبھا کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ دو منٹ چپ چاپ کھڑا رہنے کے بعد وہ باہر آ گیا۔ اُس کے اندر جو شعلہ بھڑک رہا تھا وہ اتنی تیز رفتار سے بجھ گیا جس تیز رفتار

سے وہ بھڑ کا تھا۔ پھر مہرا نے چترویدی سے پوچھا۔ ''آپ انھیں شمشان گھاٹ کس وقت لے جائیں گے؟''

''دس بجے کا وقت رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر کہ 'میں پھر آؤں گا' مہرا اپنے گھر چلا گیا۔

گھر واپس جاتے ہوئے نہ جانے اُس کے دماغ میں کتنے خیالات پیدا ہوئے اور اُس نے کتنے سوال اپنے آپ سے پوچھے۔ آخر میں اس نے اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ 'جو کچھ ہوا وہ قدرت کا کھیل تھا جس میں جو کردار اُس کو دیا گیا وہ اُسے نبھانا ہی تھا چاہے وہ کردار اُسے اچھا لگا یا نہیں لگا'۔ گھر جا کر اُس نے اپنی بیوی سے شوبھا کی موت کا ذکر کیا۔ نہانے اور ناشتہ کرنے کے بعد وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہوا اور چلا گیا۔ وہ دوبارہ چترویدی کے گھر نہیں گیا۔ چاہے جو شعلہ اُس کے اندر تھا وہ بجھ تو گیا تھا مگر ویسے نہیں جیسے وہ چاہتا تھا۔ پھر ایک دم اُسے نجومی کی پیشین گوئی یاد آئی۔ ''آپ اُسے اپنے آپ بھول جائیں گے۔''

OO

ووٹ کا حقدار

''سنا بھائی دربارے کیا حال ہے تیرا؟''

''میرا تو حال ٹھیک ہے بھگوانے۔ تُو سنا؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں یار۔ سنا ہے کل تو شہر گیا تھا۔''

''ٹریکٹر کی قسط بھرنی تھی۔ یار وہاں تو بڑی رونق تھی۔''

''شہر میں رونق نہیں ہوگی تو پھر کہاں ہوگی؟''

''یار میں آنے والے چناؤ کی بات کر رہا ہوں۔''

''اچھا یہ بات ہے، تو بتا اس بار تو ووٹ کس کو دے رہا ہے؟''

''تو کس کو دے رہا ہے؟''

''یار پہلے میں نے پوچھا ہے۔ تو بتا۔''

''ابھی کچھ سوچا نہیں۔ ایک کرسی کے لیے دس امیدوار ہیں۔''

''مگر مقابلہ تو دو میں ہی ہے۔ گیانی ہربھجن سنگھ اور کامریڈ گردیال سنگھ۔''

''برابر کی ٹکر ہے مگر ہیں دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔''

''پرانے گھاگھ ہیں۔ برسوں سے لڑ رہے ہیں۔ کبھی گیانی کا پلڑا بھاری تو کبھی کامریڈ کا۔''

''سیاست بھی اب ایک پیشہ ہو گیا ہے۔''

''وہ تو ہے ہی۔ جنتا کے نام پر سیاست دان اپنی جیبیں بھرتے ہیں۔''

''وہ زمانہ گیا جب اُمیدواروں کی اصولوں پر ٹکّر ہوتی تھی۔''

''آج کل تو سبھی ذاتی مفاد کو دیکھتے ہیں۔''

''چناؤ سے پہلے ایسے سبز باغ دِکھاتے ہیں جیسے اُن کی حکومت بنتے ہی سارے ہندستان کی کایا پلٹ جائے گی۔''

''تجھے یاد ہوگا، پچھلے چناؤ میں کامریڈ نے کسانوں کو بجلی اور پانی مفت دینے کا یقین دلایا تھا۔ دیا کچھ بھی نہیں۔ بجلی دو گھنٹے آتی دو دس گھنٹے غائب رہتی ہے۔''

''پانی چوبیس گھنٹے میں ایک گھنٹہ ملتا ہے۔ کسان بچارا نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا۔''

''کنویں بند کروا کے سرکار نے ٹیوب ویل تو منگوادِیے مگر جب بجلی نہیں تو پانی کہاں سے آئے گا۔''

''سرکار نے ستلج بندھ بنوایا تھا تا کہ کسانوں کو بہتات سے بجلی میسّر ہو۔ ہوتا کیا ہے ساری بجلی شہروں کو چلی جاتی ہے۔''

''یار یہ سیاست دان بڑے اُستاد ہیں۔ گیانی نے اپنی پارٹی کا نام سماج کلیان رکھا ہے۔ نام سماج کا کلیان اپنا۔''

''اور کامریڈ نے اپنی پارٹی کا نام سماج سیوک رکھا ہے۔ نام سماج کا سیوا اپنی۔''

''وہ تو وہ، چناؤ نشان بھی کیا چُن چُن کر رکھے ہیں۔ سماج کلیان کا چناؤ نشان ہے گنّا۔ رس خود پی جاتے ہیں گودا جنتا کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔''

''سماج سیوک کا نشان ہے بھُٹا۔ دانے تو خود کھا جاتے ہیں چھلکا جنتا کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔''

''ان نیتاؤں کی نظر میں جنتا تو گائے بھینس کے برابر ہے۔ دودھ نکال لو اور پیٹ بھرنے کے لیے جنگل میں چھوڑ دو۔ سارا دن چر کر شام کو واپس گھر آ جائے گی۔''

''مجھے تو لگتا ہے اس بار کامریڈ کا پلڑا بھاری ہے۔''

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ چناؤ سے دو دن پہلے گیانی ایسا پینترا بدلے گا کہ ووٹروں کا جھکاؤ اس کی طرف ہو جائے گا۔"

"بات تو تیری ٹھیک ہے بھگوانے۔ یہ لوگ گڑے مُردوں کو اُکھاڑ لاتے ہیں۔ وہ بھی عین موقع پر تا کہ جواب دینے کے لیے مخالف کے پاس وقت ہی نہ رہے۔"

"ایک بات ہے۔ ہیں دونوں بدمعاش۔"

"بدمعاش! اوّل درجے کے غنڈے ہیں۔"

"کامریڈ تو تین بار جیل جا چکا ہے۔ سالے نے دو قتل کروائے تھے۔ آج تک کچھ نہیں ہوا۔ نہ جانے یہ لوگ کیسے بچ جاتے ہیں۔"

"گیانی کہتا تو اپنے آپ کو سنت ہے۔ مگر کئی عورتوں کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ بیچاری جسبیر کور کو اس نے دن دہاڑے مروا دیا تھا۔ پانچ سال ہو گئے ہیں اس واردات کو آج تک کوئی بھی نہیں پکڑا گیا۔"

"پولیس بھی ان کے اشارے پر ناچتی ہے۔ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کرنا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"دربارے یہ بتا یار، یہ سالی جمہوریت آئی کہاں سے؟"

"سنا ہے انگریزوں نے اسے پیدا کیا، امریکہ والوں نے اس کی پرورش کی۔"

"وہاں بھی ایسی دھڑے بازی ہوتی ہے جیسے ہمارے ملک میں؟"

"یار مجھے معلوم نہیں۔ جب ہم اور کاموں میں انگریزوں کی نقل کرتے ہیں تو جمہوریت میں بھی اُن کی نقل کرتے ہوں گے۔"

"گویا ہمارا اپنا کچھ نہیں۔"

"کیوں نہیں، اپنا ووٹ ہے۔"

"ووٹ کیا ہے؟ کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ ڈالو یا نہ ڈالو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"وہ تو ہے۔ ڈالنا تو پڑے گا ہی۔"

"مگر کس کو، ہے کوئی حقدار اس کا؟"

"حقدار تو کوئی نہیں۔ مگر جب دو بُرائیوں میں ایک چننی ہو، کوئی بھی چن لو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"لگتا ہے تمھارا اشارہ گیانی کی طرف ہے۔ پچھلی بار بھی تم نے یہی کہا تھا اور ووٹ گیانی کو ڈالا تھا۔"

"در بارے بات یہ ہے گیانی کا پلڑا اس بار بھاری لگتا ہے۔ میں اگر ووٹ نہ بھی ڈالوں وہ پھر بھی جیت جائے گا۔ میرا ووٹ بیکار جائے گا۔ کم از کم ایک بوتل تو مل جائے گی۔"

"ایک بوتل سے کیا ہوتا ہے؟"

"ہوتا تو کچھ نہیں، مگر بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں ہمیں بوتل نہیں لینی چاہیے۔ تھوڑے سے لالچ کے لیے ہم اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔"

"بات تو ٹھیک ہے تیری۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں ہمارا نمائندہ کہتا ہے وہ خسارہ کہاں سے پورا کرے گا۔ تبھی تو وہ اُلٹ پلٹ کام کرتا ہے۔ ایک بوتل دے کر دس وصول کرتا ہے۔"

"یار اس بار میں بوتل نہیں لوں گا۔ نمائندہ کچھ کرتا رہے یہ اُس کی اپنی ضمیر ہے۔ کم از کم ہمارا اپنا ضمیر تو صاف ہونا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ میں بھی نہیں لوں گا۔"

OO

شبِ زفاف

شبِ زفاف وہ شب ہے جس کا ہر بانکے جوان اور دوشیزہ کو بے صبری سے انتظار رہتا ہے۔ یہ وہ شب ہے جو زندگی میں بار بار نہیں آتی۔ یہ وہ شب ہے جب دو جسموں کے اتصال میں کوئی خوف نہیں ہوتا، نہ سماج کا نہ قانون کا۔ کمل جیت سنگھ باوا اسی رات کا کئی سالوں سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر وہ رات آ ہی گئی۔ رمنیک کور کے ساتھ ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے میں اب کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔

کھانا کھانے کے آدھا گھنٹہ بعد کمل جیت کی ماں تیج کور نے رمنیک سے کہا ''بیٹی اب تم جا کر آرام کرو۔'' پھر اُس نے اپنی کنواری بیٹی ہرمیت سے کہا ''بیٹی، دُلہن کو اُس کا کمرہ دکھا دے۔''

ہرمیت اپنی بھابھی کا ہاتھ پکڑ کر اُس کے کمرے میں لے گئی اور مسکرا کر کہنے لگی ''بھابھی بھیّا کو ابھی بھیج دیتی ہوں۔ اُس کے بغیر اُداس ہو رہی ہو گی۔''

رمنیک نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیس منٹ کے بعد تیج کور نے اپنے بیٹے سے کہا ''کمل بیٹا اب تو بھی جا۔ دُلہن تیرا انتظار کر رہی ہو گی۔''

کمل جیت پہلے ہی مضطرب تھا۔ فوراً اُٹھ کر چلا گیا۔ غسل خانے میں جا کر کپڑے بدلے اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا رمنیک بیاہ والا جوڑا بدل کر شب خوابی میں پلنگ پر پیٹھ کے بل سو رہی تھی اور چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ کمل جیت

جب اُس کے پاس جا کر بیٹھا تو وہ سرک کر پلنگ کے کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔ کمل جیت نے نزدیک جا کر جب اُسے ہاتھ لگایا تو وہ اک دم تلخی سے بولی ''مجھے ہاتھ مت لگانا۔ میں کسی اور کی ہوں''۔

کمل جیت کو حیرانی ہوئی۔ اس نے کہا ''کیا کہہ رہی ہو تم؟''

رمنیک نے صاف الفاظ میں جواب دیا ''میں کسی اور سے محبّت کرتی ہوں۔ میں تمھارے ساتھ بیاہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میرے ماں باپ نے زبردستی کی''۔

''اگر یہ بات تھی تو تم نے مخالفت کیوں نہیں کی۔ مجھ سے ایسا بے ہودہ مذاق کیوں کیا؟''

''میں نے مخالفت کی تھی مگر میرے ماں باپ نے مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ میں بے بس تھی''۔

''اس کا مطلب یہ ہوا تم اپنی جان بچانے کے لیے میری زندگی سے کھیلنا چاہتی تھیں''۔

رمنیک نے منہ لٹکاتے ہوئے کہا ''میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں شور مچاؤں گی۔ جب اڑوس پڑوس کے لوگ شور سن کر یہاں آئیں گے تو میں کہوں گی کیونکہ جہیز میں تمھارے والدین کی خواہش کے مطابق سونا اور نقدی نہیں لائی تم نے مجھے زندہ جلانے کی دھمکی دی ہے''۔

کمل جیت سمجھ گیا یہ عورت آسانی سے قابو میں نہیں آئے گی۔ اگر اس کو کچھ کہا گیا تو یہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے گی۔ اُس نے اس موضوع پر اور کوئی بات نہیں کی۔ بس اتنا ہی کہا ''ٹھیک ہے۔ مگر رات تو مجھے یہیں گزارنی ہے''۔

رمنیک نے جواب دیا۔ ''تم پلنگ پر سو جاؤ۔ میں صوفے پر سو جاؤں گی''۔

صبح دونوں آٹھ بجے اُٹھ بیٹھے۔ کمل جیت نے رمنیک سے کوئی بات نہیں کی۔ نہا دھو کر اُس نے ناشتہ کیا اور دس بجے کے قریب کام پر چلا گیا۔ اُس کے والد کی تلک نگر دلّی میں جیل روڈ پر فرنیچر کی دُکان تھی۔ کمل جیت اور اُس کا بڑا بھائی امر جیت سنگھ بھی اپنے والد کے

ساتھ مل کر دُکان پر کام کرتے تھے۔ جب کمل جیت پریشان دِکھائی دیا تو امر نے پوچھا ''کمل کیا بات ہے؟ کچھ پریشان لگتے ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تمھاری؟''

کمل نے اپنے بھائی کو جب رات والا قصہ سنایا تو وہ چونک پڑا۔ رات کو گھر آ کر اُس نے اپنے ماں باپ کو بھی وہ بات بتائی۔ آپس میں بات چیت کرنے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ رمنیک پر کڑی نظر رکھی جائے اور اُسے گھر سے باہر نہیں جانے دیا جائے۔ رمنیک کا کمل جیت کے ساتھ ایسا شرم ناک اور ناجائز سلوک سارے خاندان کے لیے بدنامی کا باعث تھا۔ انھوں نے تہیہ کیا کہ اس موضوع پر نہ رمنیک اور نہ ہی اُس کے والدین سے کوئی بات کی جائے۔

کچھ دن ہونے پر جب رمنیک نے اپنے میکے جانے کی اجازت مانگی تو اُنھوں نے اُسے ٹال دیا۔ جب رمنیک کا بھائی اُسے لینے آیا اُنھوں نے رمنیک کو بھیجنے سے انکار کر دیا۔ اب رمنیک وہاں سے نکلنے کے لیے تلملا رہی تھی۔ وہ اپنے عاشق سُمیت سنگھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھی۔ اُسے شاید یہ اُمّید تھی کہ باوا کے گھر والے اُسے گھر سے نکال دیں گے تو اُسے سُمیت سے ملنے کے لیے پوری آزادی ہوگی۔ مگر گھر کی چار دیواری میں بند رہ کر اُس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

کوئی دو ہفتے کے بعد جب سُمیت کا فون آیا تو فون امر جیت کی بیوی جسونت کور نے اُٹھایا۔ اُس نے بے دھڑک ہو کر پوچھا ''تم کون ہو؟ رمنیک سے تمھارا کیا رشتہ ہے۔''

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اور فون رکھ دیا۔ دو دن کے بعد جب اُس کا دوبارہ فون آیا تو جسونت کور نے شائستگی سے کہا ''میں جانتی ہوں تم کون ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں تم رمنیک سے محبت کرتے ہو اور وہ بھی تم سے محبّت کرتی ہے۔ مگر میں تمھیں بتا دوں کی تم ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔''

سُمیت کو ایسا محسوس ہوا کہ جسونت کو اُن دونوں سے ہمدردی تھی۔ اُس نے التجائی لہجے میں کہا ''اگر تم ہماری کچھ مدد کر دو تو میں ہمیشہ کے لیے تمھارا مشکور رہوں گا۔ میں رمنیک کے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم ہی مجھے بچا سکتی ہو۔"

جسونت نے جواب دیا "تم مجھے دو دن بعد دو پہر کو کسی وقت فون کرنا۔ میں تمھارے ملنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوں گی۔"

سُمیت نہیں جانتا تھا کہ جو کچھ جسونت کہہ رہی تھی وہ امر جیت اور کمل جیت کے مشورے سے ایک گہری چال چل رہی تھی۔ کیونکہ وہ عشق میں اندھا تھا اُس کی باتوں میں آ گیا، لیکن اتنے میں کیا ہوا ایک دن رمنیک گھر سے بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہاں سے نکل کر وہ سیدھی سُمیت کے گھر گئی۔ کیونکہ اب وہ شادی شدہ تھی سُمیت کے والدین نے اُسے سمجھایا کہ اب سُمیت کا خیال چھوڑ دو۔ اُنھوں نے سُمیت کو بھی سمجھایا۔ مگر دونوں کب کسی کی سننے والے تھے۔

باوا خاندان کو یہ تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ رمنیک کا عاشق سُمیت تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ پنجابی باغ میں رہتا تھا۔ اُس کے باپ کا موتی نگر نجف گڑھ روڈ پر بجلی کا سامان بنانے کا کارخانہ تھا۔ کیونکہ وہ امیر آدمی تھا اور سیاسی پارٹی کا کارکن بھی تھا، باوا خاندان اُس سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ انھوں نے ایک نئی تجویز بنائی جس کے مطابق اُنھوں نے سُمیت کو رمنیک سے ملنے کے لیے اپنے گھر آنے دیا۔ مگر وہ جب بھی آتا تیج کور اور جسونت کور اُس پر نظر رکھتے تھے کہ خالی بات چیت سے آگے بات نہیں بڑھنی چاہیے۔

آہستہ آہستہ جسونت رمنیک سے بھی اپنی ہمدردی جتانے لگی۔ جب بھی سُمیت رمنیک سے ملنے آتا وہ اُس کی اچھی طرح سے خاطر تواضع کرتی۔ وہ خوبصورت تھی اور رمنیک سے صرف دو سال ہی بڑی تھی۔ اُس نے جان بوجھ کر سُمیت پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیے۔ سُمیت اُس کے چکر میں آ گیا۔ ایک دن جب رمنیک جسونت اور سُمیت بیٹھے باتیں کر رہے تھے جسونت نے رمنیک سے کہا "آج چائے تو بنا دے۔"

جب رمنیک چائے ٹرے میں رکھ کر لائی۔ اُس نے دیکھا کہ جسونت اور سُمیت ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بڑے مزے سے باتیں کر رہے تھے۔ ٹرے اُس کے

ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گری۔ ٹرے گرنے کی آواز سن کر وہ جھٹ ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مگر رمنیک یہ برداشت نہیں کر سکی۔ اُس نے اگلے دن سُمیت کو فون کر کے کہا "آئندہ یہاں مت آنا۔ تم نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ تمھاری خاطر میں نے اپنے شوہر کو پاس نہیں پھٹکنے دیا اور تم میری نظروں کے سامنے جسونت سے عشق کرنے لگے ہو۔" سُمیت نے اُس کی بہت منت سماجت کی مگر وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ اُس نے فون رکھ دیا۔ باوا خاندان کی چال کا یہ پہلا قدم تھا۔

ایک بار تو رمنیک کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ جسونت کا سُمیت سے گھل مل کر باتیں کرنا اور موقع ملنے پر ایک دوسرے کے گلے لگ جانا کہیں باوا خاندان کی کوئی چال تو نہیں تھی۔ کیونکہ جسونت رمنیک سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اُسے سُمیت کی نیت پر شک ہونے لگا۔ اُس کی دماغی حالت کچھ عجیب تھی۔ جوانی کی راتیں وہ اکیلی بستر پر گزار رہی تھی۔ حالانکہ کمل جیت اور وہ دونوں ایک ہی کمرے میں سوتے تھے مگر ساتھ ساتھ نہیں۔ ایک رات جب رمنیک سے اکیلا پن برداشت نہ ہوا وہ صوفہ سے اُٹھ کر کمل کے ساتھ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ کمل نے اُسے جھٹک دیا اور اُٹھ کر خود صوفہ پر لیٹ گیا۔

حالانکہ رمنیک نے سُمیت کو فون پر اُس کے گھر آنے کے لیے منع کیا تھا مگر جسونت نے اسے آنے سے نہیں روکا۔ رمنیک کو اور بھی غصہ آتا۔ ایک دن اُس نے جان بوجھ کر شور مچایا کہ سُمیت اور جسونت کمرے میں ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہے تھے۔ شور سن کر تیج کور اُوپر آ گئی۔ تینوں نے مل کر سُمیت کو پکڑ لیا اور فون کر کے پولیس کو بلایا۔ سُمیت کے پاس وہاں آنے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ پولیس نے سُمیت کو مداخلتِ بے جا کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ کیونکہ سُمیت کا والد سیاسی پارٹی کا اہم کارکن تھا اُس نے اپنے رسوخ سے اپنے لڑکے کو چھڑا لیا۔

مگر اُس نے ایک مہینے کے اندر سُمیت کا بیاہ کروا دیا۔ کیونکہ والدین کی نظر میں سُمیت بگڑ چکا تھا اس لیے اُس کو ازدواجی زندگی میں باندھ کر رکھنا ہی اُس کی آوارہ گردی اور لڑکیوں

سے چھیڑ چھاڑ پر بندش لگانے کا یہی واحد طریقہ تھا۔

جب رمنیک کو یہ خبر ملی کہ سُمیت نے شادی کرلی ہے وہ آپے سے باہر ہوگئی۔ ایک دن چپکے سے وہ سُمیت کے گھر چلی گئی اور اُس کی بیوی کے سامنے اُس کی بے عزّتی کی۔ اُسے دغاباز، بے شرم اور نہ جانے کیا کیا اُوٹ پٹانگ کہا۔ سُمیت نے رمنیک کے باپ کو فون کر کے بلایا۔ اُس کا باپ اُس کو پکڑ کر گھر لے گیا اور اُسے سمجھایا ''بیٹی، جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تم سُمیت کو بھول جاؤ تو اچھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تم نے اپنے شوہر کو اپنے پاس نہ آنے دینے کا جرم بھی کیا ہے اور گناہ بھی۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ جا کر کمل جیت اور اُس کے خاندان سے معافی مانگ لو۔ میں بھی کمل جیت سے بات کروں گا۔''

رمنیک نے اپنے باپ کو تلخی سے جواب دیا ''اس ساری مصیبت کی جڑ آپ ہیں۔ آپ جانتے تھے میں سُمیت سے محبت کرتی ہوں اور کمل جیت سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر آپ سب نے میرے ساتھ زبردستی کی۔''

رمنیک کی ماں نے کہا ''بیٹی، تمھارے والد ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ جو ہو گیا ہو گیا۔ کمل جیت سے جا کر معافی مانگ لو۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ اگر تم کمل جیت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو کیا کرو گی۔ تم جانتی ہو اب تم سُمیت کے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔''

رمنیک چپ کر گئی اور واپس باوا کے گھر چلی گئی۔ وہاں کسی نے اُس کا استقبال نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے پوچھا وہ کہاں گئی تھی اور کیوں گئی تھی۔

رمنیک کے پاس کمل جیت سے سمجھوتہ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر حقیقت میں اب کمل جیت اُس سے نفرت کرتا تھا کیونکہ اُس نے نہ صرف اُس کو دھوکا دیا تھا، اُس کے ساتھ بے ہودہ مذاق بھی کیا تھا۔ وہ بد اعمال بھی تھی۔ سُمیت کے ساتھ ناجائز تعلقات ہوتے ہوئے بھی اُس نے کمل جیت سے شادی کی۔ کمل جیت سمجھ گیا تھا کہ اب رمنیک اُس کے ساتھ اُس کی زوجہ بن کر رہنا چاہتی تھی مگر یہ اُس کی مجبوری تھی۔ اگر اب بھی سُمیت اُس کو قبول کرے تو وہ پھر اُس کے پاس رہنے کے لیے تیار ہو جائے گی اور اُسے چھوڑ دے گی۔

جب کمل جیت نے دیکھا کہ رمنیک اُس کے نزدیک آنے کی پوری کوشش کر رہی ہے اُس نے اُس کے کمرے میں سونا بند کر دیا۔ وہ علیحدہ سونے لگا۔ رمنیک جتنا اُس کو منانے کی کوشش کرتی وہ اُس سے اتنا دُور بھاگتا۔ یہاں تک کہ اب باوا خاندان کا اُس کے ساتھ ایسا سلوک تھا جو ایک گھر کی نوکرانی سے ہوتا ہے۔ اب سوائے شمیت کے اس کا اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اُس نے شمیت کو پرانی محبت کا واسطہ دیا۔ گزرے زمانے کی یادیں تازہ کرنے کی کوشش کی مگر اُس نے رمنیک کو سہارا دینا تو ایک طرف رہا اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ وہ کبھی اِدھر بھاگتی تو کبھی اُدھر۔ اب نہ سسرال میں اُس کی عزت تھی نہ میکے میں۔ نہ سسرال میں کوئی اس کی سنتا تھا نہ میکے میں۔ آخر تنگ آ کر اُس نے ایک شام اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔

OO

آخر مراد بر آئی

جب تین بجے کے لگ بھگ رام دت مدھوک اسکول سے گھر لوٹا۔ اس کی بیوی شانتی دیوی رو رہی تھی۔ اُس نے پوچھا "کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے۔" جب شانتی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ سمجھ گیا کہ اُس کا چوتھا بچّہ بھی خدا کو پیارا ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے وہ تین بچّے اُسی طرح کھو چکے تھے۔ پیدائش کے ایک مہینے کے اندر اندر کسی رازِ سربستہ کی وجہ سے وہ اس دُنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اُسے یاد تھا جب اُس کے پہلے بچّے کی موت ہوئی تھی اُس وقت وہ صرف پچیس دن کا تھا۔ رات کو وہ بچّہ ماں باپ کے بیچ سو گیا۔ صبح جب رام دت کی آنکھ کھلی اور اُس نے شانتی سے کہا 'اُٹھو، اُٹھ کر دودھ کی بوتل تیار کرو۔ بلّو اُٹھنے والا ہے۔ اُٹھتے ہی دودھ کے لیے شور مچائے گا۔' شانتی نے اُٹھ کر دودھ گرم کیا۔ بوتل میں ڈالا اور جب اُس نے بوتل کی چوسنی اُس کے ہونٹوں سے لگائی تو اُس نے اپنا منہ نہیں کھولا۔ یہ سوچ کر کہ شاید وہ ابھی نیند میں ہے شانتی نے اُسے آہستہ سے ہلایا۔ مگر جب بچّے کی طرف سے اُٹھنے کی کوئی علامت نظر نہ آئی تو وہ چونک پڑی۔ اُسے کیا معلوم اُس کا بلّو ہمیشہ کے لیے اُنھیں خیر باد کہہ کر چلا گیا تھا۔ ایسے ہی اُن کا دوسرا اور تیسرا بچّہ اُنھیں غم کے طوفان میں چھوڑ گیا۔ اب چوتھا بھی اُنھیں پھر سے اکیلا کر گیا۔ انھوں نے اب سوچا کہ بچّے کے پیدائش ہونے کے کچھ دن بعد اُس کے بچھڑ جانے سے تو یہی بہتر ہو گا کہ آگے بچّہ پیدا ہی نہ ہو۔ وہ

دونوں اور غم برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لیے اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔

رام دت مدھوک انبالہ شہر میں دیانند آریہ ہائی اسکول میں ریاضی کا ٹیچر تھا۔ وہ نویں اور دسویں جماعت کے طلبا کو پڑھاتا تھا۔ پچھلے بائیس سال سے وہ اُسی اسکول میں تھا۔ حقیقت میں اُس نے اپنی ساری زندگی تعلیمی ادارے کے حوالے کر دی تھی۔ ریاضی میں تو وہ ماہر تھا ہی مگر قابلِ تعریف بات یہ بھی تھی کہ اُس کا چال چلن قابلِ مثال اور قابلِ تقلید تھا۔ کوئی بھی چھوٹا یا بڑا اُس کا نام لے کر نہیں بلاتا تھا۔ سب اُسے ماسٹر جی کہتے تھے۔ وہ سیدھا سادہ اور دل کا صاف تھا۔ کوئی بری عادت نہیں تھی۔ سادہ رہن سہن، سادہ کھانا پینا اور سادے صاف ستھرے کپڑے پہننا یہ سب اُس کے اُصول تھے۔ رِشی دَیانند کے فرمانوں میں اُسے پورا اعتماد تھا۔ اُس کی بیوی بھی اُتنی ہی نیک اور حلیم تھی۔ اگرچہ ماسٹر جی کو کبھی کبھی اُن طلبا پر غصّہ آ جاتا تھا جو پڑھنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے مگر شانتی سے تو غصّہ دُور بھاگتا تھا۔

اسکول کے نزدیک جس گھر میں وہ رہتے تھے وہ دَیانند تعلیمی ادارے کا تھا جس کا کرایہ معمولی سا تھا۔ دو کمروں کا گھر اُن کے لیے کافی تھا۔ ماسٹر جی کو کئی بار دوسرے اسکولوں سے زیادہ تنخواہ پر کام کرنے کی پیشکش کی گئی مگر اُس نے منظور نہیں کی۔ وہ تو اپنی زندگی پہلے ہی دَیانند اسکول کے لیے وقف کر چکا تھا۔

اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد اکیس سال کی عمر میں مدھوک نے دَیانند اسکول میں نوکری شروع کی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ پورے ساٹھ سال کی عمر میں وہ اسکول سے ریٹائر ہوا۔ یک مشت پنشن، پراویڈنٹ فنڈ، گریجویٹی وغیرہ کی رقم سے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا کیونکہ اُسے دَیانند تعلیمی ادارے کی طرف سے دیا ہوا گھر ایک سال کے اندر خالی کرنا تھا۔ میاں بیوی نے ریٹائرڈ زندگی کے لیے کئی اصول بنائے جن میں سے ایک ہر صبح چھ بجے سیر کرنے کا تھا۔ دو میل چلنے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے پارک میں آ کر بیٹھ جاتے۔ وہاں کئی بچے بھی آتے تھے جن کو ہنستے کھیلتے دیکھ کر اُنھیں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کئی بچّے تو اُن

سے اتنا گھل مل گئے تھے کہ اُنھیں دیکھتے ہی جھٹ اُن کے پاس بھاگ کر آجاتے تھے۔ اُن بچّوں کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے علاوہ وہ اُنھیں کچھ اچھی باتیں بھی بتاتے تھے اور اُن کو اچھا شہری بننے کے لیے ترغیب دیتے تھے۔ مکان خریدنے کے بعد جو رقم بچ گئی تھی اُنھوں نے وہ بینک میں رکھ دی۔ اُس سے جو سود ملتا تھا اُس سے مشکل سے گزر ہوتی تھی۔ ماسٹر جی نے اپنے گھر پر کچھ بچّوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح ٹیوشن سے جو آمدنی ہوتی وہ اب اُن کے لیے تسلّی بخش تھی۔ اُن کا گزارہ اب اچھی طرح سے ہونے لگا۔

مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ ہَوا میں نمی ہونے کی وجہ سے صبح تھوڑی ٹھنڈ ہوتی تھی۔ مدھوک اور شانتی حسبِ معمول سڑک پر سیر کر رہے تھے۔ سورج طلوع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ اچانک شانتی کو کسی بچّے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اُس نے مدھوک سے کہا "مجھے کسی نوزائیدہ بچّے کے رونے کی آواز سنائی دی ہے۔ کیا آپ نے بھی سنی؟"

"نہیں تو۔"

ماسٹر جی نے کہا۔ "تمھیں تو خواب میں بھی بچّوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کل رات کوئی خواب......"

ابھی ماسٹر جی نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ وہ آواز اُنھیں بھی سنائی دی۔ اُنھوں نے کہا۔ "تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے بھی سنائی دی ہے۔"

مگر اُن کو کچھ پتہ نہیں لگ رہا تھا کہ رونے کی آواز کہاں سے آرہی تھی۔ وہ وہیں رُک گئے۔ وہ آواز پھر آئی۔ اُنھیں لگا آواز پارک کے کسی کونے سے آرہی تھی۔ جب اُنھوں نے اندر جا کر دیکھا تو حیران رہ گئے۔

ایک نوزائیدہ بچّہ جو شاید کچھ گھنٹے پہلے ہی پیدا ہوا تھا ایک کمبل میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ نزدیک جا کر اُنھوں نے جھک کر دیکھا۔ بچّہ بڑی آہستہ رفتار سے سانس لے رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ مدھوک نے جھٹ بچّے کو گود میں اُٹھایا اور گھر لے آئے۔ اُس وقت

پارک میں اور کوئی آدمی دِکھائی نہیں دیا تھا۔ گھر آکر شانتی فوراً پڑوسن کے گھر گئی اور دودھ پلانے والی بوتل لے آئی۔ جب اُس نے بوتل میں دودھ ڈال کر اُس کی چوسنی بچّے کے ہونٹوں سے لگائی تو وہ جلدی سے سارا دودھ پی گیا۔ اتنے میں جس پڑوسن سے شانتی بوتل لائی تھی وہ بھی آگئی۔

بچّے کی خبر تیزی سے سارے پڑوس میں پھیل گئی۔ کئی پڑوسی اشتیاق سے وہاں آدھمکے۔ اب سوال یہ تھا کہ بچّے کا کیا کیا جائے۔ شانتی نے کہا 'ہم اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں'۔ ماسٹر جی کی بھی یہی خواہش تھی مگر کسی نیک پڑوسی نے مشورہ دیا 'آپ اسے اسی وقت تھانے لے جاؤ۔ وہاں رپورٹ لکھوادو اور ان سے کہو کہ ہم بچّے کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ کل کو کسی نے آپ پر یہ الزام لگا دیا کہ آپ نے بچّے کو اِغوا کیا ہے تو آپ کیا کریں گے۔ کیونکہ آپ کے اپنا بچّہ نہیں ہے، پولیس کو یقین ہو جائے گا کہ آپ نے بچّہ چُرایا ہے'۔

ایک اور پڑوسی نے کہا ''ان کی بات ٹھیک ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

باتوں باتوں میں نو بج گئے تو پڑوسی نے کہا ''اب آپ اور دیر مت کیجیے۔ بچّے کو لے جایئے۔''

وہ بچّے کو نزدیک کے تھانے میں لے گئے۔ ابھی تھانے دار نہیں آیا تھا۔ پولیس محکمہ کے ایک کارکن نے کہا ''آپ بیٹھیے۔ تھانے دار صاحب آنے والے ہیں۔''

وہ دونوں اور اُن کا پڑوسی ایک بینچ پر بیٹھ کر تھانے دار کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ کوئی دس منٹ بعد تھانے دار آگیا۔ جب اُس کی نظر ماسٹر جی پر پڑی تو اُس نے جھٹ پہچان لیا۔ کسی وقت وہ اُن کا شاگرد تھا۔ اُس نے دیکھتے ہی ماسٹر جی کو سلام کیا اور آنے کی وجہ پوچھی۔ پھر کہا ''آیئے آپ میرے ساتھ آیئے۔ دفتر میں بیٹھ کر بات چیت کریں گے۔''

دفتر میں لے جا کر تھانے دار پرتاپ چند مجیٹھا نے اُنھیں باعزّت کرسی پر بٹھایا اور

پوچھا" آپ یہاں کیسے؟"
مدھوک نے ساری بات تفصیل سے بتائی اور جب بچّے کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش ظاہر کی تو مجیٹھا نے کہا" آپ اس عمر میں اتنے چھوٹے سے بچّے کی دیکھ بھال کیسے کریں گے، اور کل کو کوئی اس بچّے کا دعویدار آ گیا تو آپ کو اسے چھوڑنے میں بہت ہی دُکھ ہوگا۔ اگرچہ ایسے دعویدار کے آنے کا امکان بہت ہی کم ہے مگر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"
شانتی نے کہا" آپ بچّے کو ہمارے پاس رہنے دیجیے۔ ہم اس کی اچھی طرح سے پرورش کریں گے۔ ہمارا اپنا کوئی بچّہ نہیں ہے۔ ہم اس کے لیے آیا رکھ لیں گے۔ آپ فکر مت کریں۔" یہ کہہ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
ماسٹر جی بولے" اگر کوئی دعویدار آ بھی گیا تو دیکھا جائے گا۔ جو خدا کی مرضی!"
مجیٹھا نے مدھوک اور شانتی کے عقیدت اور خلوص سے بھرے جذبے کو دیکھ کر رجسٹر میں رپورٹ درج کر کے بچّے کو اُن کے حوالے کر دیا۔ وہ ماسٹر جی کی بڑی عزّت کرتا تھا۔ اُس نے کہا" چلیے میں اپنی جیپ میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ بچّے کو دیکھنے کے لیے میں ہر ہفتے آپ کے گھر آ جایا کروں گا۔" پھر اُس نے اُن سب کو اُن کے گھر چھوڑ دیا۔
کچھ دنوں کے بعد جب مجیٹھا ماسٹر جی سے ملنے کے لیے اُن کے گھر گیا تو اس نے کہا۔
"ماسٹر جی شاید آپ کو یاد ہوگا جب میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ آپ نے ایک بار امتحان کے دوران مجھے نقل کرتے ہوئے پکڑ لیا تھا۔ جس کاغذ سے میں نقل کر رہا تھا وہ آپ نے مجھ سے لے کر چپکے سے اپنی جیب میں ڈال لیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو مجھے سزا دے سکتے تھے۔ مجھے فیل کر سکتے تھے اور اسکول سے نکلوا بھی سکتے تھے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اگلے دن آپ نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر کہا' دیکھو بیٹا! نقل کر کے تم پاس ہو سکتے ہو۔ تمھیں کوئی نوکری بھی مل جائے گی۔ یا کوئی کام بھی کر لوگے مگر زندگی میں ترقی نہیں کر سکو گے۔ کیونکہ نقل کرنا تمھاری عادت بن جائے گی، تم میں سوچنے کی ہمّت نہیں رہے گی۔ اور جب

سوچنے کی قوت کو کھودو گے تم میں خود اعتمادی نہیں رہے گی۔ جس شخص میں خود اعتمادی نہ ہو وہ کتنا بھی زور لگا لے اُونچا نہیں اٹھ سکتا'۔ آپ کا وہ سبق میرے دل میں گھر کر گیا۔ میں نے نقل کرنا چھوڑ دیا۔ اپنی محنت اور پختہ دلی سے انڈین پولیس سروس میں کامیاب ہوا۔ میں ہمیشہ آپ کا مشکور رہوں گا۔"

ماسٹر جی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "بیٹا، میں بھی تمھارا مشکور رہوں گا۔ تم نہیں جانتے اس بچّے کی وجہ سے ہمارے گھر میں کتنی رونق آگئی ہے۔ اسے دیکھ کر ہمارے دلوں کو اتنا سکون ملتا ہے کہ جس کا بیان میں الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ اس بچّے نے تو ہماری سوکھی زندگی میں ہریالی لا دی ہے۔ تمھاری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید وہ بچّے کو ہمارے حوالے نہ کرتا۔ کسی اناتھ آشرم میں بھیج دیتا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مدھوک اور شانتی بچّے کی اتنی مستعدی اور دل و جان سے پرورش کر رہے تھے کہ شاید اُس کے اپنے ماں باپ بھی نہ کرتے۔ وقت پر اُسے کھلاتے پلاتے نہلاتے اور اُس کی تفریح کے لیے بازار سے کھلونے لے آتے۔ اگر وہ بیمار لگتا تو اُسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔ انھوں نے پہلے اُس کا نام رکھنے کی رسم پوری کی۔ پھر اُس کا مُنڈن کروایا۔ اُس کا نام گوتم رکھا گیا مگر وہ اُسے پیار سے منّا کہہ کر بلاتے تھے۔ انھوں نے اُسے ہاتھوں اور گھُٹنوں کے بل چلتے دیکھا پھر اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے دیکھا۔ شور مچاتے ہوئے دیکھا۔ دوڑتے ہوئے دیکھا۔ بولتے ہوئے دیکھا۔ اور کبھی کبھی ہٹ کرتے ہوئے دیکھا۔ اگر وہ اُنھیں تنگ کرتا یا کوئی ہنگامہ کرتا تو وہ اُسے کچھ نہیں کہتے تھے۔ نہ وہ اُسے دھمکی دیتے یا ڈراتے اور نہ ہی اُسے کبھی مارتے۔ ہاں، مگر اُنھیں ہمیشہ یہ فکر ستائے رکھتی کہ کوئی اُسے اُن سے چھین نہ لے۔ جب مجیٹھا نے اُنھیں آ کر بتایا کہ اُس کا تبادلہ دہلی ہوگیا ہے۔ وہ بہت گھبرائے مگر اُس نے اُنھیں یقین دلایا کہ وہ اپنے جانشین سے کہہ کر جائے گا۔ اُس نے اُنھیں تسلّی دی کہ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

دیکھتے دیکھتے گوتم چار سال کا ہوگیا۔ جب ایک دن ماسٹر جی شانتی کو ساتھ لے کر گوتم کو اسکول میں داخل کروانے کے لیے گئے تو پرنسپل نے پوچھا "بچّے کے ماں باپ کہاں ہیں؟ انھیں خود آنا پڑے گا۔"

"ہم ہی اس کے ماں باپ ہیں۔" ماسٹر جی نے جواب دیا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ بچّے کی عمر صرف چار سال ہے اور آپ ستر سے کم نہیں لگتے۔" پرنسپل نے حیرانی سے پوچھا۔

جب ماسٹر جی نے پرنسپل کو پوری داستان سنائی تو وہ کہنے لگے "اب میں سمجھا۔ کچھ سال پہلے میں نے کسی اخبار میں اس بارے میں پڑھا تھا۔ آپ نے اسے بڑھاپے میں دو دن کے بچّے کو گود لے کر اُس کی پرورش کی، یہ کسی کرشمہ سے کم نہیں۔"

گوتم آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ ماسٹر جی کی ذاتی دلچسپی اور تعلیم کی وجہ سے وہ پڑھائی میں کافی ہوشیار اور مستقیم نکلا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی۔ جب اُس نے ایم.اے کر لیا تو ماسٹر جی کی صلاح سے اُس نے آئی.اے.ایس کا امتحان دیا جس میں وہ کامیاب رہا اور چُنا گیا۔ اُس وقت ماسٹر جی کی عمر اٹھاسی سال کی تھی۔ اتنے سالوں سے مجیٹھا مدھوک خاندان سے ملنے نہیں آیا تھا مگر گوتم کی کامیابی کی خبر سنتے ہی وہ انھیں مبارک باد دینے کے لیے دوڑتا آیا۔ گوتم یہ تو جانتا تھا کہ مدھوک اور شانتی نے اُسے گود لیا تھا مگر مجیٹھا نے جب پہلی بار پوری بات بتائی تو گوتم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کہنے لگا "آپ نے میرے لیے اتنی تکلیفیں اُٹھائیں اس کی جان کاری مجھے نہیں تھی۔ آپ نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ میرے لیے خوشی اور فخر کی بات تو ہے ہی مگر میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا کہ آپ نے اتنی عمر میں یہ سب کچھ کیسے کیا۔"

ماسٹر جی نے جواب دیا "بیٹا، ہم نے کچھ نہیں کیا۔ جب ایک انسان کو دوسرے انسان سے محبّت ہو جائے، وہ ہر مشکل خوشی سے جھیل لیتا ہے۔ اُسے نہ تو کوئی تکلیف ہوتی ہے اور

نہ کسی قسم کا غم۔ اس کے برعکس اس کی روح کو تسکین ملتی ہے۔ جب تو ہمارے ساتھ سو جاتا تھا، ہماری گود میں آ کر بیٹھ جاتا تھا، اپنی باتوں سے ہمارا دل بہلاتا تھا، مسکراتا تھا اور چاہے کبھی کبھی ہٹ بھی کرتا تھا مگر جو مسرّت ہمیں تیری موجودگی سے ملتی تھی اور اب بھی ملتی ہے۔ میں اس کا بیان الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ جب تو باپ بنے گا اپنے آپ سمجھ جائے گا۔"

سرکاری نوکری ملنے پر گوتم اپنے ماں باپ کو ساتھ لے کر دہلی آ گیا اور ایک کرایے کے مکان میں رہنے لگا۔ مگر جذباتی لگاؤ کی وجہ سے اپنے پرانے مکان کو بند کر کے تالا لگا دیا اُسے بیچا نہیں۔ اتنے میں گوتم کی شادی کے لیے کئی رشتے آنے لگے۔ لڑکیاں دیکھتے اور غور کرتے کرتے دو سال گزر گئے۔ آخر میں جس لڑکی کو گوتم نے پسند کیا اُس کا نام آکرتی تھا۔ اُس کا باپ ایک بہت بڑا کارخانے دار تھا جو اتفاقاً مدھوک کو اسکول کے زمانے سے جانتا تھا۔ کیونکہ آکرتی کا تعلق ایک امیر خاندان سے تھا، اُسے گھر کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی کسی قسم کی ٹریننگ تھی۔ اُسے گھر سے باہر گھومنے پھرنے اور کلبوں میں جانے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ مدھوک اور شانتی کی اتنی عزّت نہیں کرتی تھی جتنا شاید وہ اور گوتم اُمید کرتے تھے۔ مگر وہ کسی طرح کی ٹوکا ٹا کی بھی نہیں کرتی تھی۔ اپنی ہی دُنیا میں مست رہتی تھی۔

کیونکہ گوتم اپنے کام میں جُٹا رہتا تھا اور کبھی کبھی رات کو گھر دیر سے آتا تھا۔ اُس کو اپنے ماں باپ سے زیادہ دیر تک بات کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا چاہے وہ دستور کے مطابق ہر صبح اُنھیں ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا تھا اور اُن کی دُعا کا ہمیشہ طلب گار رہتا تھا۔ پھر بھی دونوں اپنے بیٹے سے مطمئن تھے۔ شادی کے دو سال بعد آکرتی نے ایک لڑکے کو جنم دیا۔ رام دت اور شانتی خوشی سے پھولے نہیں سمائے کیونکہ اُنھیں ایک بار پھر بچّے کی رفاقت کا موقع مل گیا۔ وہ اُس کو ایسے سینے سے لگائے رکھتے کہ اُس کی ماں بھی شاید نہیں لگاتی تھی۔ حقیقت میں اشوک کے پیدا ہونے کے دو مہینے بعد آکرتی پھر سے گھومنے پھرنے باہر چلی جاتی۔ بچّے کی دیکھ بھال یا تو آیا کرتی تھی یا پھر اُس کے دادا دادی۔ اب وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ بچّے

کی زیادہ دیر تک دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی جتنا اُن سے بن پاتا وہ راضی خوشی سے بچّے کی پرورش کرتے۔

جب اشوک دو سال کا ہوا تب ماسٹر جی کی عمر چورانوے تھی اور شانتی بانوے کی تھی۔ دونوں کی صحت کچھ بگڑ چکی تھی۔ اگر شانتی کو دَمہ کی شکایت رہتی تو ماسٹر جی کو کھانسی تنگ کرتی تھی۔ ایک دن آکرتی نے گوتم سے کہا ''اشوک کو ان دونوں بیماروں سے دُور رکھنا چاہیے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں اُن کی بیماری کا اثر بچّے پر نہ پڑے۔''

گوتم نے جواب دیا ''اشوک تو ویسے بھی اُن کے پاس بہت کم رہتا ہے۔ اس میں فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔ اُن کا بھی بچّے کے ساتھ دل لگا رہتا ہے۔''

آکرتی نے کچھ بے رُخی کے ساتھ جواب دیا ''آپ کو اُن کی زیادہ فکر ہے۔ آپ کو بچّے کے مستقبل کی فکر نہیں ہے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں خدانخواستہ اگر بچّے کو بیماری لگ گئی تو اُس سے ساری عمر چھٹکارا پانا مشکل ہو جائے گا۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟'' گوتم نے کچھ غصّے میں کہا۔

''میں سوچ رہی تھی انھیں اپنے پُرانے مکان میں بھیج دیں۔ اڑوس پڑوس میں ان کی جان پہچان ہے ان کا دل بھی لگ جائے گا۔'' آکرتی نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم نہیں جانتیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم چاہتی ہو میں اُن کو بڑھاپے میں گھر سے نکال دوں۔'' گوتم نے غصّے میں کہا۔

اُن دونوں کی گفتگو اتّفاق سے مدھوک اور شانتی نے سن لی۔ مگر اُنھوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس وقت آکرتی بھی آگے نہیں بولی مگر اُس نے آیا کو ہدایت کی کہ وہ اشوک کو دادا دادی کے نزدیک نہ جانے دے اور اگر وہ چلا بھی جائے تو اُسے فوراً اُن سے لے آئے۔ اس عمر میں اشوک ہی ان کی مسرّت کا باعث تھا وہ بھی آکرتی نے اُن سے چھین لیا۔ وہ اشوک کو دُور سے ہی دیکھ کر خوش ہوتے مگر بہو کے ڈر سے اُسے اپنے پاس نہیں بلاتے۔

آیا سب کچھ دیکھتی رہتی کہ کیسے دادا دادی بچے کو سینے سے لگانے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ جب آگرتی گھر پر نہیں ہوتی تو آیا کچھ لمحوں کے لیے اشوک کو اُن کے پاس چھوڑ دیتی۔ مگر ایک دن کیا ہوا۔ اشوک اپنے دادا دادی کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اچانک آگرتی گھر آگئی اور اشوک کو اُن کے ساتھ دیکھ کر آگ بگولا ہو اٹھی۔ اُس نے اُسی وقت اشوک کو اُن سے چھین لیا اور اُسے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے پھر آیا کو بلا کر اُسے بہت ڈانٹا۔ مدھوک نے اس واقعے کا ذکر اپنے لڑکے سے نہیں کیا۔ وہ بیٹے اور بہو کی ازدواجی زندگی میں کوئی خلل نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ جو شادمانی اور سکون اُن کو اشوک کے جنم سے ملے تھے وہ رفتہ رفتہ مایوسی میں بدل رہے تھے۔ اُنھیں ایسا محسوس ہوا اب اُن کے زندہ رہنے کا نہ کوئی مقصد تھا اور نہ ہی کوئی منزل۔ ویسے بھی وہ بہت لاغر ہو گئے تھے۔

ایک شام جب وہ دونوں صحن میں بیٹھے تھے مدھوک نے کہا ”اب ہمارا یہاں کوئی کام نہیں۔ چلو چلتے ہیں۔“

شانتی نے حیرانی سے پوچھا ”کہاں؟ اب کیا ہم اپنے پرانے گھر جائیں گے میں تو یہیں رہوں گی اور یہیں مروں گی۔“

”ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ میں تو جا رہا ہوں۔“ مدھوک نے پکّے ارادے سے کہا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ اس بڑھاپے میں ہم کہاں جائیں گے؟“ شانتی کو تعجب ہوا۔

”میں پرانے مکان کی بات نہیں کر رہا۔“

”تو کہاں کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ شانتی تذبذب میں پڑ گئی۔

مدھوک نے فلک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”وہاں، جہاں سب جاتے ہیں۔ ہمارا اصلی گھر تو وہی ہے۔ یہاں تو ہم سیر سپاٹا کرنے آئے تھے، کرلیا۔ پتہ نہیں تم تھک گئی ہو یا نہیں میں تو بہت تھک گیا ہوں۔“

شانتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کے پاس کوئی مناسب جواب تھا ہی نہیں!

مدھوک کو شاید کسی روحانی طاقت نے اشارہ کر دیا تھا کہ دنیا کے اڈّے سے کوچ کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تبھی وہ بہکی بہکی باتیں کر رہے تھے۔ وہ اُسی رات ہی چلے گئے۔
کچھ دن کے بعد ایک دن شانتی مدھوک کی تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ تصویر کو مخاطب کرتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔ ''تم نے خوشی غمی میں میرا ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا مگر آخر تم مجھے اکیلا چھوڑ گئے۔ کچھ بھی ہو میں تمھارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ میں بھی جلد ہی آ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اُس نے اپنی پیشانی اپنے شوہر کی تصویر کے آگے رکھ دی اور مدھوک کی طرح دنیا کو خیرباد کہہ کر ہمیشہ کے لیے چلی گئی۔
جب کبھی گوتم گھر سے باہر اپنا قدم رکھتا وہ آسمان کی طرف کچھ پل کے لیے ضرور دیکھتا۔ شاید اُس کے ماں باپ دِکھائی دے جائیں۔

OO

نشے کے یار

دن ڈھلتے ہی سیوارام جِلد ساز اپنی دُکان بند کرکے سیدھا اپنے گھر جاتا تھا۔ اکیلا آدمی تھا۔ شادی تو کی تھی مگر کنبھ میلہ میں اپنی بیوی سے کئی سال پہلے ایسا بچھڑا کہ پھر وہ ملی ہی نہیں۔ اُس نے دوبارہ شادی نہیں کی۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہفتہ میں تین چار دن رات کا کھانا خود بناتا تھا۔ باقی دن نتھو کے ڈھابے پر جاکر کھاتا تھا۔ گھر لوٹتے وقت راستے میں شراب کی دُکان سے ایک پوّا اور کبھی کبھی اَدھا ضرور خریدتا تھا۔ اکیلے بیٹھ کر پینے کی عادت تھی۔ جس رات ڈھابے پر کھانا ہوتا پوّا جیب میں ڈال لیتا تھا کیونکہ ڈھابے پر شراب پینا منع تھا۔ وہ میز کے نیچے بوتل کھول کر پیتل کے گلاس میں شراب ڈال لیتا تھا۔ پھر پانی ملاکر گلاس کو میز کے اوپر رکھ کر ایسے انداز سے پیتا تھا کہ کسی کو شک نہ ہو کہ وہ شراب پی رہا ہے۔ ڈھابے کا مالک نتھو اس کی چال سے واقف تھا مگر وہ اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ اُس کا پرانا گاہک تھا۔

ایک رات سیوارام ڈھابے کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھا شراب پی رہا تھا کہ اچانک اُس کی نظر ایک شخص پر پڑی جو ڈھابے کے دوسرے کونے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ بھی سیوارام کی طرح شراب پیتل کے گلاس میں ڈال کر پی رہا تھا۔ کبھی سیوارام اُس کی طرف دیکھتا، تو کبھی وہ سیوارام کی طرف دیکھتا، ایسا کرتے کرتے آدھ گھنٹہ ہوگیا۔ پھر نہ جانے

دونوں کو کیا سوجھی وہ اپنی اپنی کرسی سے اُٹھے اور گلاس کو ہاتھ میں پکڑ کر ایک دوسرے کی جانب چل پڑے۔ جب وہ مقابل میں آئے تو سیوا رام نے کہا ''تمھیں میں نے پہلے کہیں دیکھا ہے۔''

وہ شخص جھٹ سے بولا ''مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میں نے بھی تمھیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔''

''تمھارا نام کہیں......''

سیوا رام نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی وہ شخص بول پڑا ''میرا نام جمنا داس ہے۔ تم......''

''ارے یار! میں مانگے رام ہوں۔''

''پہچان تو لیا تھا مگر نام یاد نہیں، آ رہا تھا۔'' جمنا داس نے جواب دیا۔

''یار گلے لگ جاؤ۔ اتنی مدّت کے بعد ملے ہو۔'' مانگے رام نے جوش کے ساتھ کہا۔

دونوں نے اپنے اپنے گلاس میز پر رکھ دِیے اور ایک دوسرے کے ساتھ ایسے گلے ملے جیسے عاشق معشوق ملتے ہیں۔

''یار تم بھولے تو نہیں ہو گے ہم شالیمار کالج میں اکٹھے پڑھتے تھے۔'' مانگے رام نے کہا۔

''تمھیں دیکھ کر سب یاد آ گیا۔ اور وہ لڑکی، کیا نام......''

''اچھّا اچھّا، تم مینکا کی بات کر رہے ہو۔ اُسے ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔''

''کیا بلا کی چیز تھی! ہم نے بہت کوشش کی مگر وہ سالی ہمارے ہتھّے نہیں چڑھی۔'' جمنا داس نے ایک لمبی سانس لے کر کہا۔

''تمھیں کبھی ملی وہ؟'' مانگے نے پوچھا۔

''نہیں تو، تمھیں کبھی ملی کیا؟''

''نہیں یار، اپنی قسمت ہی ایسی تھی۔'' مانگے رام نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''یار اتنے سالوں کے بعد ملے ہو۔ آج کھانے کا بِل میں دوں گا۔'' جمنا داس نے خلوص کے ساتھ کہا۔

''نہیں یار، میں دوں گا۔ پہلے میں نے تمھیں دیکھا تھا۔'' مانگے نے جواب دیا۔

''نہیں یار، یہ نہیں ہوسکتا۔ آج کا کھانا میرے نام۔ میں نے پہلے پیش کش کی تھی۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔''

''چلو یار، پھر ایسا کرتے ہیں۔ میرا بل تم دینا۔ تمھارا بل میں ادا کروں گا۔ مگر کل تم میرے مہمان ہوگے۔'' جمنا نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''جیسے تم ٹھیک سمجھو۔ تمھیں ناراض تو نہیں کرسکتا۔''

پیتے پیتے اور باتیں کرتے کرتے رات کے بارہ بج گئے۔ نتھّو نے آ کر کہا۔ ''ڈھابہ بند کرنے کا وقت ہوگیا ہے۔ اب آپ لوگ اپنا بِل چکاؤ اور گھر جاؤ۔''

مانگے نے پوچھا۔ ''جمنا داس یہ تو میں پوچھنا بھول گیا کہ تم رہتے کہاں ہو؟''

''بیلارپور میں۔''

''بیلاپور میں! یہ تو کمال کی بات ہے۔'' مانگے نے حیرت سے کہا۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' جمنا نے بھی حیرت سے پوچھا۔

''یار میں بھی بیلاپور میں رہتا ہوں۔''

''کمال کی بات تو ہے ہی۔ یہ بتاؤ کتنے سال سے رہ رہے ہو؟''

''پچھلے دس سال سے۔''

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ میں بھی دس سال سے وہاں رہ رہا ہوں۔''

''چلو تمھیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' جمنا داس نے کہا۔

''نہیں یار، تم فکر مت کرو۔ میں اپنے آپ چلا جاؤں گا۔ تمھیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اس میں تکلیف کیسی۔ اتنے سالوں بعد ملے ہو، اکیلے جاؤ گے۔ میرا بھی تو کوئی فرض بنتا ہے۔'' جمنا نے اپنی بات کو اہمیت دیتے ہوئے کہا۔

''جیسے تمھاری مرضی، تمھیں ناراض تو نہیں کرسکتا۔''

بیس منٹ چلنے کے بعد مانگے رام ایک مکان کے گیٹ کے آگے آکر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا ''میرا گھر آ گیا ہے۔''

''اچھا یار، تو میں چلتا ہوں۔ پھر ملیں گے۔'' جمنا داس نے جواب دیا۔

مانگے بولا۔ ''تم گھر اکیلے جاؤ گے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اتنے سالوں کے بعد ملے ہو۔ میرا بھی تو کوئی فرض بنتا ہے۔ تمھیں چھوڑ آتا ہوں۔''

''جیسی تمھاری مرضی، تمھیں ناراض تو نہیں کرسکتا۔'' جمنا داس نے آہستہ سے کہا۔

سیوا رام اپنے گھر کے اندر نہیں گیا۔ وہ جمنا داس کے ساتھ اُسے اُس کے گھر پر چھوڑنے کے لیے چل پڑا۔ اس طرح اُنھوں نے تین چکّر لگائے۔ رات کے دو بج گئے۔ اتنے میں گشت کی پولیس نے اُنھیں چکّر لگاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُسے اُن دونوں کے چال چلن پر شک ہوا۔ اُس نے اُن دونوں کو راستے میں روک لیا اور پوچھا ''کون ہو تم؟ اتنی رات یہاں کیا کر رہے ہو؟''

مانگے نے جمنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یار، یہ ہم سے پوچھ رہا ہے ہم کون ہیں اور یہاں کیا کر رہے ہیں۔ تو ہی بتا اِسے۔''

جمنا نے کہا ''یار، اُس نے تجھ سے پوچھا ہے۔ تو ہی بتا دے اُسے۔''

پولیس والے نے غصّے میں آ کر کہا ''میں تم دونوں سے پوچھ رہا ہوں۔''

جمنا داس بولا ''ہم تمھیں کیا دِکھائی دیتے ہیں؟ چور، بدمعاش......''

پولیس والے نے سوچا یہ ٹھیک سے نہیں بتائیں گے۔ اُس نے وائرلیس سے پولیس کی جیپ بلائی اور دونوں کو اُس میں بٹھا کر تھانے لے گیا۔ اُنھیں رات بھر علیحدہ علیحدہ کوٹھری میں

بند کر دیا گیا تاکہ وہ مل کر شور نہ مچائیں۔ دونوں سو گئے۔

صبح سات بجے جب سیوارام کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو جیل کی کوٹھری میں بند دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی۔ اُس نے اُدھر سے گزرتے ہوئے جیل کے عملے کے ایک آدمی سے کچھ پوچھنا چاہا مگر اُس نے سنی اَن سنی کر دی۔ نو بجے کے قریب جس پولیس والے نے اُسے رات کو پکڑا تھا وہ آیا۔ کوٹھری کا تالا کھولا اور بولا "چلو تھانے دار صاحب بلا رہے ہیں۔"

"تم نے مجھے یہاں کس لیے بند کیا ہے؟" پولیس والے نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جب اُسے تھانے دار کے سامنے حاضر کیا گیا تو تھانے دار نے پوچھا "کیا نام ہے تمھارا؟"

"سیوارام" اُس نے جھٹ سے جواب دیا۔

پولیس والے نے ٹوکتے ہوئے کہا "جناب، رات کو تو یہ اپنا نام مانگے رام بتا رہا تھا۔"

اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "جناب میرا نام سیوارام ہے۔"

"کیا کرتے ہو؟" تھانے دار نے پوچھا۔

"جِلد ساز ہوں۔ بڑا بازار میں میری ایک چھوٹی سی دُکان ہے۔"

"رات کے دو بجے تم کہاں تھے؟" تھانے دار نے پوچھا۔

"جناب دُکان بند کر کے میں تو گھر جا رہا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں ہے۔ مجھے وقت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔" سیوارام نے جواب دیا۔

"تمھارے ساتھ اور کون تھا؟" تھانے دار نے سوال کیا۔

"جناب میں اکیلا تھا۔" سیوارام نے فوراً جواب دیا۔

پولیس والے نے پھر ٹوکتے ہوئے کہا "جناب، یہ پھر جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ساتھی تھا۔"

"جناب میں سچ بول رہا ہوں۔ میرے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔" سیوارام نے عاجزی سے جواب دیا۔

تھانے دار نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو حکم دیا۔ "دوسرے شخص کو لے آؤ۔"

پانچ منٹ بعد جمنا داس کو لاکر کھڑا کر دیا گیا۔ تھانے دار نے پوچھا "کیا نام ہے تمھارا؟"

"کشن۔"

پولیس والے نے غصّے میں کہا "یہ بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ رات کو اس نے اپنا نام جمنا داس بتایا تھا۔"

"کیا کرتے ہو؟" تھانے دار نے پوچھا۔

"رنگ ساز ہوں۔"

سیوارام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تھانے دار نے پوچھا "اس شخص کو جانتے ہو؟"

کشن نے سیوارام کی طرف دیکھ کر کہا "جناب میں اسے نہیں جانتا۔"

پولیس والے کو ایک بار پھر غصہ آیا۔ اُس نے کہا "یہ پھر جھوٹ بول رہا ہے۔ کل رات دونوں ایک ساتھ سڑک پر گھوم رہے تھے۔"

کشن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "جناب۔ میں تو اس شخص کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ رات کو اس کے ساتھ کیسے ہو سکتا تھا۔ میں تو اکیلا تھا۔ گھر جا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔"

سیوارام نے ہمت کر کے پوچھا "جناب، میرا قصور کیا ہے؟ میں نے کوئی چوری نہیں کی۔ کسی کی جیب نہیں کاٹی۔ کسی سے کوئی جھگڑا نہیں کیا۔ شریف آدمی ہوں......"

تھانے دار نے ڈانٹتے ہوئے کہا "بند کرو یہ بک بک۔ جو پوچھا جائے اُسی کا جواب دو۔"

دو چار سوال اور کرنے کے بعد جب تھانے دار کو یقین ہو گیا کہ رات کو شراب کے نشے میں ان دونوں کو کچھ علم نہیں کہ وہ کیا کر رہے تھے۔ اُس نے اُنھیں کہا۔

"میں تمھیں آج چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر تم نے ایسا ناجائز کام پھر کبھی کیا تو تمھیں ہمیشہ کے لیے کوٹھری میں بند کر دوں گا۔"

جب وہ جانے لگے تو تھانے دار نے اپنے عملے کے ایک آدمی کو اُن کا پیچھا کرنے کے لیے اشارہ کیا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ کیا یقیناً وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ اگر جانتے ہیں تو تھانے سے باہر جا کر وہ کچھ نہ کچھ بات ضرور کریں گے۔

مگر جب وہ تھانے کے گیٹ سے باہر نکلے، ایک دوسرے پر نظر ڈالے بغیر اور کوئی بات کیے سیوا رام دائیں طرف چلا گیا اور کشن بائیں طرف۔ پولیس والا کبھی دائیں طرف دیکھتا تو کبھی بائیں طرف، کہیں وہ آگے چل کر ایک ساتھ تو نہیں مل جاتے۔ وہ دونوں کو دائیں بائیں باری باری سے اُس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ اُس کی نظر سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ پھر اپنا سر کھجلاتا ہوا واپس اپنے اڈّے پر آ گیا۔

OO

چٹپٹی کھیلنے والی

دہلی یونیورسٹی میں دلیپ کمار ایم. ایس. سی کا طالب علم تھا۔ وہ علم طبعیات میں زمین اور اُس کے گرد گھومتے ہوئے سیاروں کی قوتِ کشش کے موضوع پر تحقیق کا خواہش مند تھا۔ کافی ذہین اور محنتی تھا۔ طبعیات میں دو بار وظیفہ بھی لے چکا تھا۔ کبھی کبھی اپنے ہم جماعتوں اور دوستوں کے ساتھ کافی ہاؤس میں کافی پینے جاتا تھا۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں طالبِ علم کافی پینے کے ساتھ ساتھ گپ شپ لڑاتے اور بیچ بیچ میں اِدھر اُدھر نظر بازی بھی کرتے تھے۔

دلیپ کمار زیادہ وقت کافی ہاؤس میں نہیں بیٹھتا تھا۔ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں اُسے لڑکیوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی آنکھیں بند تو نہیں رکھتا تھا مگر اُنھیں گھور گھور کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ لڑکی چھوٹے قد کی ہو یا لمبی، گوری ہو یا سانولی، موٹی ہو یا پتلی بن سنور کر آئے یا معمولی پوشاک میں اُسے سب ایک جیسی لگتی تھیں۔ اگر کوئی ساتھی کہہ دے 'دلیپ وہ دیکھو۔ کیا پٹاخہ ہے۔' وہ ہنس کر کہتا 'پاس مت جانا۔ کہیں پھٹ گیا تو ہاتھ جل جائیں گے۔'

ایک بار ایک دوست نے پوچھا 'یار، ایک بات بتا تجھے لڑکیاں اچھی کیوں نہیں لگتیں؟ شادی بھی کرو گے یا نہیں؟' تو دلیپ کمار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا 'علم طبعیات کو پہلے طلاق دینا پڑے گا۔'

مگر ایک دن کیا ہوا۔ جب وہ کافی پی رہا تھا، اچانک اُس کی نظر کچھ دُور دو لڑکیوں پر

پڑی۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے میز کے آر پار اپنی اپنی کرسی پر بیٹھی کافی پی رہی تھیں اور کچھ کھا بھی رہی تھیں۔ دونوں دیکھنے میں اچھی لگتی تھیں۔ اُن میں سے ایک لمبے قد کی تھی مگر دوسری سے عمر میں چھوٹی لگتی تھی۔ اُس کے نین نقش بھی اچھے تھے۔ اُس کے بائیں گال پر ایک چھوٹا سا کالا تل تھا جس کی وجہ سے وہ اور بھی دلکش لگتی تھی۔ وہ تھوڑی دیر اُن کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی نظر ہٹالی۔ کافی ختم ہونے کے بعد وہ اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا اور اُن دونوں لڑکیوں کو بھول گیا۔

دو دن کے بعد جب دلیپ کافی ہاؤس آیا تو اُسے پھر وہ لڑکیاں دِکھائی دیں۔ ایک بار پھر وہ اُن کی طرف دیکھتا رہا اور کافی پی کر چلا گیا۔ اس بار وہ اُنھیں بھلا نہیں سکا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا یہ کیا چکّر ہے۔ خدا جانے مجھے اُس لمبی لڑکی میں اچانک کیوں دلچسپی ہوگئی ہے۔ میرا دل کرتا ہے اُس سے ملوں اور بات چیت کروں۔ مگر اُسے خیال آیا کہ اگر میں لڑکی کے چکّر میں پڑ گیا تو میرا علمِ طبیعیات زمین پر ہی رہ جائے گا۔

اگلے سوموار جب دلیپ کافی ہاؤس آیا، وہ دونوں لڑکیاں دِکھائی نہیں دیں۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا 'اچھا ہوا نہیں آئیں۔ نہ وہ آئیں گی نہ میں دیکھوں گا، نہ مجھے کشش ہوگی نہ دل میں ہلچل ہوگی۔' مگر ایک ہی پل میں اُسے ایسا لگا کہ اُن کے نہ آنے سے بھی اُس کا دل نہیں لگ رہا ہے۔ کبھی وہ دِکھائی دیتیں تو کبھی نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دلیپ سوچ میں پڑ گیا کہ لمبی والی سے کیسے بات کی جائے۔ اُس سے ملنے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک یہ کہ وہ ہمیشہ اپنی سہیلی کے ساتھ ہوتی تھی، دوسری اُس نے کبھی بھی دلیپ کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ آنکھ ملانا تو دُور رہا۔ اب وہ لگا دماغ کے گھوڑے دوڑانے کہ اُس سے ملاقات کیسے ہوسکتی ہے۔ اُسے خیال آیا کہ پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ ہے کون؟

ایک دن جب وہ دونوں کافی ہاؤس سے باہر آئیں، دلیپ نے اُن کا پیچھا کیا۔ وہ دونوں شعبۂ قانون کے کتب خانے کے اندر چلی گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ دونوں شعبۂ قانون کی طالبات تھیں۔ اُس کا ایک دوست بھی اُسی شعبہ کا طالبِ علم تھا۔ اُس نے جب اُن لڑکیوں

کے بارے میں پوچھا تو اُس کے دوست نے کہا" تم کس کی بات کر رہے ہو؟ لمبی کی یا چھوٹی کی؟"

دلیپ نے جواب دیا" دونوں کی۔"

اُس کے دوست نے ہنستے ہوئے کہا" کیا دونوں سے عشق ہو گیا ہے؟"

"نہیں یار، ایسی کوئی بات نہیں۔ تم بتاؤ تو سہی۔"

"لمبی والی کا نام آشا کرن ہے۔ وہ پہلے سال کی طالب عِلم ہے۔ دوسری کا نام آونتی بھوپتی ہے۔ وہ تیسرے یعنی آخری سال میں ہے۔"

"یہ رہتی کہاں ہیں؟" دلیپ نے سوال کیا۔

اُس کے دوست نے پھر ہنستے ہوئے کہا" یار، عشق تم فرما رہے ہو اور اُن کا پیچھا کرنے کے لیے مجھ سے کہہ رہے ہو۔ ایک دن خود اُسی بس میں سوار ہو جاؤ جس سے وہ جاتی ہیں۔ جہاں وہ اُتریں تم بھی اُتر جانا۔ اپنے آپ اُن کے گھر تک پہنچ جاؤ گے۔" پھر مذاق کرتے ہوئے اُس نے کہا" گھر کا نمبر ضرور نوٹ کر لینا۔ کہیں خط لکھنے کی ضرورت نہ پڑ جائے۔"

جیسے دلیپ کمار نے اُن دونوں کے بارے میں اپنے دوست کے ذریعے جانکاری حاصل کی تھی ویسے ہی آونتی نے اپنے دوست کے ذریعے دلیپ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں۔ کیونکہ اُس نے کئی بار دلیپ کو اپنا اور اپنی سہیلی آشا کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تھا وہ بھی اتنی ہی خواہش مند تھی جتنا دلیپ اگرچہ دونوں کا مقصد ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ جہاں دلیپ پہلے کافی ہاؤس اپنے یار دوستوں کے ساتھ جاتا تھا، اب اکیلا جانا پسند کرنے لگا۔ شاید آشا اُسے اکیلی مل جائے اور اُس سے کچھ بات چیت ہو جائے۔ مگر یہ موقع اُس کو نہیں ملا۔

ایک دن جب وہ کافی ہاؤس کے اندر گھسا اُس نے اُن دونوں سہیلیوں کو کافی پیتے ہوئے دیکھا۔ وہ چپکے سے اُن کے نزدیک اپنی پیٹھ اُن کی طرف کر کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اُن کی باتیں سننے لگا۔ اُن دونوں نے اُسے نہیں دیکھا۔ باتوں باتوں میں اُس کا ذکر آیا۔ اُس

کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ بڑے دھیان سے اُن کی گفتگو سننے لگا۔ آونتی نے کہا "دلیپ تمھیں بڑا گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ لگتا ہے تم پر لٹو ہو گیا ہے۔"

آشا نے جواب دیا "دیکھنے دو۔ میرا کیا جاتا ہے۔"

"ہے تو خوبصورت۔ سنا ہے کافی ذہین بھی ہے۔ لگتا ہے آگے چل کر بڑا آدمی بنے گا۔"

آشا نے منھ بنا کر کہا "تو میں کیا کروں؟"

"دوستی کر لو۔ نہ جانے کتنی اُمید سے تمھارا پیچھا کرتا ہے۔ تمھیں ہر روز دیکھ کر بھی اُس کا جی نہیں بھرتا۔" آونتی نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

آشا پہلے تو ایک دو منٹ کے لیے خاموش رہی پھر تھوڑا غصّے میں بولی "اب بس بھی کرو نا، بہت ہو چکا۔ تمھیں کئی بار بتایا ہے مجھے اس شخص میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

آونتی نے بڑے خلوص کے ساتھ جواب دیا "تو تو بُرا مان گئی۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔"

آشا نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا "مجھے ایسے مذاق اچھے نہیں لگتے۔"

اُن کی گفتگو سن کر دلیپ کو حیرانی ہوئی۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا کہ آخر اُن دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے۔ یہ جاننے کے لیے وہ کچھ پریشان رہنے لگا۔

ایک روز دلیپ اُسی بس میں چپکے سے سوار ہو گیا جس سے وہ گھر جاتی تھیں۔ دونوں کملا نگر اسٹاپ پر اُتر گئیں۔ وہ بھی وہیں اُتر گیا اور اُن کے پیچھے چلتا رہا۔ پانچ منٹ کے بعد آونتی ایک کوٹھی کے آگے آ کر رُکی۔ اُس نے آشا سے کہا "اچھا میں چلتی ہوں۔ کل پھر ملیں گے۔" یہ کہہ کر وہ گیٹ سے کوٹھی کے اندر چلی گئی۔

اب آشا اکیلی تھی۔ دلیپ نے سوچا اُس سے بات کرنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ اُس نے پاس جا کر دُعا سلام کی۔ آشا نے مُڑ کر دیکھا تو سہی، مگر کوئی جواب نہیں دیا۔ دلیپ بولا۔ "آپ کو کئی بار کافی ہاؤس میں دیکھا ہے۔ کبھی بات کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

جب آشا نے کوئی جواب نہیں دیا تو دلیپ نے کہا "شاید آپ کو میری بات ناگوار گزری۔"

اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنے میں اُس کا گھر آ گیا۔ گیٹ سے وہ اپنے گھر چلی گئی۔ دلیپ سوچنے لگا یہ بڑی عجیب لڑکی ہے۔ نہ میری بات کی طرف توجہ دیتی ہے اور نہ خود کچھ بولتی ہے۔ نہ مسکراتی ہے۔ نہ غصہ کرتی ہے۔ اسے ذاتی طور پر جاننے کے لیے دلیپ کا اضطراب اور بڑھ گیا۔

کئی روز تک دلیپ اُن دونوں کا پیچھا کرتا رہا۔ بس سے اُتر کر آونتی اپنی کوٹھی میں چلی جاتی اور آشا اپنے گھر۔ کئی بار دلیپ نے آشا سے بات کرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ کی طرح اُس نے سنی اَن سُنی کر دی۔ ایک دوپہر جب وہ اُن کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا اُس نے دیکھا کہ آشا بھی آونتی کے ساتھ اُس کی کوٹھی میں چلی گئی۔ دلیپ گیٹ کے باہر رُک گیا۔ جب انھوں نے کوٹھی کا دروازہ اندر سے بند کر لیا تو ہمت کر کے دلیپ بھی گیٹ سے اندر چلا گیا اور صحن میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر وہ کھڑکی کے شیشے سے اندر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ دونوں صوفے کے اوپر ایک دوسرے کے ساتھ اتنی قریب بیٹھی تھیں جیسے عاشق معشوق بیٹھتے ہیں۔

آونتی نے اپنا ہاتھ آشا کے کندھے پر رکھ کر اُسے اپنی طرف آہستہ سے کھینچا۔ اُس نے آشا کے گالوں اور ہونٹوں کو چوما۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے آشا کی قمیض کے بٹن کھول دِیے اور قمیض ہٹا کر اُس کی چھاتیوں کو آہستہ آہستہ سہلانے لگی۔ پھر ایک ہاتھ سے اُس نے آشا کا ایک پستان پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے اُس کی جینس کا زِپ کھول دیا۔ دونوں میں کوئی بات ہوئی۔ وہ اُٹھ کر ساتھ کی آرام گاہ میں چلی گئیں۔

آرام گاہ کا پورا نقشہ تو دلیپ کو دِکھائی نہیں دیا مگر اُن کے ہلنے ڈُلنے سے کچھ نہ کچھ نظر آتا تھا۔ دونوں نے ایک ایک کر کے اپنے سارے کپڑے اُتار دِیے۔ آشا پلنگ پر پیٹھ کے بل لیٹ گئی۔ آونتی اُس کے اوپر۔ مگر دلیپ کو حیرت ہوئی کہ سیدھا لیٹنے کی بجائے وہ اُس کے اوپر اُلٹا لیٹی تھی۔ مطلب یہ کہ جس طرف آونتی کے جسم کا اوپر والا حصہ تھا اُس طرف آشا کے جسم کا نچلا حصہ تھا۔ دلیپ اُن کو اُسی انداز میں چھوڑ کر واپس آ گیا۔

اب دلیپ کو سمجھ آیا کہ آشا کو اُس میں کیوں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ہم جنس پسند تھی۔

بس میں بیٹھا وہ غور کرنے لگا کہ طبیعیات میں تو اُس نے یہی پڑھا تھا کہ مقناطیس کے متضاد قطب ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور مشابہ قطب ایک دوسرے کو دھکیلتے ہیں۔ یہاں تو اُلٹا حساب تھا۔ یہاں تو مشابہ قطب ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ شاید طبیعیات اور شہواتِ نفسانی میں کوئی میل نہیں تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد جب وہ کتاب نکال کر پڑھنے لگا تو کتاب کے اندر سے ایک آواز آئی "آ گیا نا واپس اپنے راستے پر۔ صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آ جائے تو اُسے بھولا نہیں کہنا چاہیے۔"

OO

گھومتا گھامتا گماشتہ

گھومتا گھامتا گماشتہ (ٹریولنگ سیلز مین) ہونے کی وجہ سے چمن لال کپور ہفتہ میں دو تین دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ وہ انگریزی دوائیں بنانے والے گنگا میڈیکل ورکس کا ایجنٹ تھا۔ ہر مہینے کی تنخواہ کے ساتھ ساتھ دوائیوں کی فروخت پر کمیشن بھی ملتی تھی۔ پنجاب اور ہریانہ کا سارا علاقہ اُس کی وسعت میں تھا۔ گرمیوں میں دوائیوں کی مانگ بڑھ جانے سے کبھی کبھی اُسے ایک ہی مقام پر دو دو رات ٹھہرنا پڑتا تھا۔ گنگا ورکس کا کارخانہ تو دہلی میں نجف گڑھ کے پاس تھا مگر کپور رہتا شاستری نگر میں تھا۔ اُس کا کنبہ چھوٹا سا تھا یعنی بیوی اور دو بچّے جو اسکول میں پڑھتے تھے۔

کپور شاستری نگر کا پُرانا رہنے والا تھا۔ اس کی کئی لوگوں سے واقفیت تھی۔ ویسے بھی اِردگرد کے کئی لوگ اُس سے مفت میں دوائی لے جاتے تھے۔ وہ نہ تو ڈاکٹر تھا اور نہ ہی کمپاؤنڈر۔ دوائیوں کے بیچ رہ کر اُسے کئی بیماریوں کا علم ہو گیا تھا۔ کون سی دوا کون سی بیماری کے لیے فائدہ مند ہے وہ یہ بھی جانتا تھا۔ کیونکہ شاستری نگر میں رہنے والے بہت سے لوگ درمیانہ طبقے سے بھی نیچے کے تھے اور زیادہ تر اَن پڑھ بھی وہ کپور کی رائے کی قدر کرتے تھے۔ اُس کی عمر چالیس سے کچھ اُوپر تھی۔ آئے دن کے سفر کی وجہ سے اُس کے چہرے کا رنگ سانولا پڑ گیا تھا۔ مگر اُس کی صحت اچھی تھی۔

ایک شام بھوانی میں کپور کو کسی دوا فروش کے ساتھ حساب کتاب کرنے میں دیر ہو گئی۔

جب کام نپٹا کر وہ بس اڈّہ پہنچا تو دہلی کی آخری بس نکل چکی تھی۔ ویسے تو وہ ہفتے میں بھوانی کا دو بار چکّر لگاتا تھا مگر رات بھر رہنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بس اڈّے سے اُس نے نزدیک کے ہوٹل کا پتہ لیا اور رِکشا میں بیٹھ کر دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ مگر ہوٹل میں اُسے کوئی خالی کمرہ نہیں ملا۔ اُس نے سوچا رات کو جو گاڑی بھوانی سے آٹھ بج کر بیس منٹ پر دہلی کے لیے نکلتی ہے اُس میں بیٹھ کر چلا جائے گا۔ جب وہ اسٹیشن پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ گاڑی چار گھنٹے لیٹ تھی۔ وہ اسٹیشن سے باہر چائے والے کی دُکان پر چائے پینے کی خواہش سے بیٹھ گیا۔ چائے پیتے پیتے اُسے ایک دم خیال آیا کہ شاستری نگر میں رہنے والی پرانی جان پہچان کی ایک لڑکی انجلی اب بھوانی میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ وہ پہلے کبھی اُس کے گھر نہیں گیا تھا۔ اُس نے اپنی پاکٹ ڈائری نکالی کہ شاید اُس کا پتہ مل جائے۔ خوش قسمتی سے اُس کا پتہ مل گیا۔ اُس نے اُسی وقت رِکشا لی اور اِدھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کر کے کوئی نو بجے کے قریب انجلی کے گھر پہنچ گیا۔

دروازہ کھولنے پر جب انجلی نے کپور کو دیکھا تو اُسے حیرت ہوئی۔ وہ بولی "انکل، آپ یہاں! آیئے اندر آیئے۔ آپ کا ہمارے گھر آنا ہماری خوش قسمتی ہے۔" کپور نے اسے آنے کی وجہ بتائی۔ انجلی نے جواب دیا "یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ آپ ہچکچایئے نہیں۔"

کپور نے پوچھا "رام پرشاد کہاں ہے؟"

انجلی نے بتایا "وہ فیکٹری کے کام سے انبالہ گئے ہوئے ہیں۔ پرسوں لوٹیں گے۔"

کوئی تین سال پہلے رام پرشاد اور انجلی دونوں شاستری نگر میں رہتے تھے۔ انجلی کا گھر کپور کے گھر سے تین گھر چھوڑ کر اُسی گلی میں تھا۔ کپور اُن دونوں کو تب سے جانتا تھا جب وہ پانچ چھ سال کے تھے۔ جب کبھی آتے جاتے انجلی کا آمنا سامنا ہو جاتا تو کپور اُس سے کچھ نہ کچھ ضرور پوچھتا۔ جیسے 'آج کل کیا کر رہی ہو؟ امتحان شروع ہو گئے کہ نہیں' اسی طرح وہ رام پرشاد سے بھی کچھ نہ کچھ پوچھتا رہتا۔

رام پرشاد اور انجلی ایک دوسرے کو اچھی طرح سے جانتے تھے۔ وہ بچپن سے ہی اکٹھے

کھیلتے آئے تھے۔ ہائی اسکول سے نکلنے کے بعد رام پرشاد تو اپنے والد کے ساتھ بنیان، موزے وغیرہ بنانے کی فیکٹری میں لگ گیا اور انجلی گھر کے کام کاج میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ سارے شاستری نگر میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ رام اور انجلی ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ ایک دن جب انجلی کا جی متلانے لگا اور سر میں چکّر آنے لگے تو وہ پاس کے ڈاکٹر سرنا سے دوائی لینے گئی۔ ڈاکٹر نے خون کی جانچ کروانے کے لیے کہا۔ جب رپورٹ آئی تو ڈاکٹر نے غصّے سے انجلی کو کہا "یہ کیا کیا تم نے؟ تم تو حاملہ ہو۔ کون ہے وہ؟"

حاملہ ہونے کا شک تو انجلی کو پہلے ہی تھا۔ جب ڈاکٹر نے اس کی تصدیق کی تو وہ گھبرا گئی اور شرم کے مارے ڈاکٹر کے کلینک سے بِنا دوائی لیے اُٹھ کر چلی گئی۔

اگلے دن جب انجلی نے رام پرشاد سے شادی کرنے کے لیے کہا تو اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنے ماں باپ سے اس بارے میں بات کرے گا۔ جب تین دن تک اُس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تو انجلی نے اُس سے پوچھا "میں کیا کروں؟"

رام پرشاد نے روکھا سا جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میرے ماں باپ نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں میری شادی اپنی برادری میں ہوگی۔ رہی بچّے کی بات، میرے خیال میں تم حمل گروادو۔ یہی ٹھیک رہے گا۔" انجلی بہت روئی۔ رام کے پاؤں پکڑے۔ اپنی محبّت کا واسطہ دیا۔ مگر رام ٹس سے مَس نہیں ہوا۔ یہ ایسی بات تھی جو وہ اپنے ماں باپ کو بتانے سے گھبراتی تھی۔

اچانک انجلی کو کپور کا خیال آیا۔ شاید وہ کوئی راستہ نکال لے۔ حقیقت میں کپور کا رام پرشاد کی ماں سے کوئی دُور کا رشتہ تھا۔ جب انجلی نے ساری بات کپور کو بتائی پہلے تو وہ کہنے لگا "میں کیا کروں۔ جب تم محبّت کا کھیل کھیل رہی تھی مجھ سے پوچھا تھا کیا؟"

انجلی رونے لگی اور کپور کے پاؤں پڑ گئی۔ روتے روتے وہ کہنے لگی "انکل، مجھے بچالو۔ اگر رام نے میرے ساتھ شادی نہ کی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔"

کپور کا دل پگھل گیا۔ کہنے لگا "اچھا میں رام پرشاد سے بات کروں گا۔ دیکھتے ہیں کیا

ہوتا ہے۔"

کپور نے رام پرشاد کو اچھی طرح سے سمجھایا "تم انجلی سے محبت کرتے ہو۔ محبت کا مطلب یہ نہیں کہ جب ایک ساتھی مصیبت میں پھنس جائے دوسرا اُس کا ساتھ چھوڑ دے۔ تمھارا تو شاید کچھ نہیں بگڑے گا، مگر تم نے سوچا اُس بچاری کا کیا ہوگا؟ وہ تو کہیں کی نہیں رہے گی۔"

رام نے جواب دیا "میں تو شادی کرنے کے لیے تیار ہوں مگر میرے والدین نہیں مانتے۔ میں کیا کروں؟"

کپور نے سیدھی بات کی "اگر تم تیار ہو تو تمھارے ماں باپ کو میں راضی کر لوں گا۔"

اُس نے کئی دن تک رام پرشاد کے ماں باپ سے بات کی۔ آخر میں وہ مان گئے۔ ڈاکٹر سرنا سے مل کر شادی سے پہلے کپور نے انجلی کا حمل گروادیا۔ شادی کے کچھ دنوں بعد جب انجلی کپور سے ملی تو کہنے لگی "انکل، میں آپ کی ہمیشہ مشکور رہوں گی۔ آپ نے تو مجھے موت کے منہ سے بچالیا۔ اگر میں کبھی آپ کے کسی کام آسکوں تو اپنی انجلی کو مت بھولیے گا۔"

شادی کے تین مہینے بعد رام پرشاد اور انجلی بھوانی چلے گئے۔ ہوا یہ کہ ہریانہ سرکار نے چھوٹے کارخانے داروں کے لیے ایک خاص اسکیم نکالی جس کے تحت کئی سہولیات دی گئیں۔ رام کے والد نے اپنے بیٹے سے کہا "یہ اچھا موقع ہے۔ تم بھوانی میں اپنی فیکٹری لگا دو۔"

بھوانی جانے سے پہلے انجلی ایک بار پھر کپور سے ملی اور اُس سے کہا "انکل، آپ کبھی بھوانی آئیں تو ہمارے گھر ضرور آیئے گا۔ ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔" اُس نے کپور کو اپنے گھر کا پتہ دیا۔

کپور بھوانی گیا تو کئی بار مگر رام اور انجلی سے نہیں ملا۔ بھوانی میں انجلی سے ملنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

جب انجلی شاستری نگر میں رہتی تھی وہ بڑی دُبلی پتلی تھی۔ گال اندر کی طرف چپکے ہوئے تھے۔ ہونٹوں کا رنگ پھیکا تھا۔ چھاتیاں برائے نام کی لگتی تھیں۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد

جب کپور نے انجلی کو دیکھا وہ حیران رہ گیا۔ اُس کے خط وخال اور جسم کی بناوٹ میں حیرت کن تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جو گال اندر کی طرف دبے ہوئے تھے اب وہ غبارے کی طرح پھول گئے تھے۔ جن ہونٹوں کا رنگ پیلا لگتا تھا اب وہ ایسے لگتے تھے جیسے تازہ گلاب کا پھول۔ جو آنکھیں پہلے چھوٹی لگتی تھیں اب وہ گہری اور بڑی دِکھائی دیتی تھیں۔ جسم اتنا پھولا ہوا اور تندرست لگتا تھا جیسے وہ سولہ سال کی دوشیزہ ہو۔

کھانا ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد کپور نے انجلی کو مسکراتے ہوئے کہا ''تم میں تو بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ کہاں وہ انجلی ایک مرجھائی ہوئی شاخ کی طرح اور کہاں یہ انجلی ایک شگفتہ پھول کی طرح۔'' بیچتا تو وہ دوائیاں تھا مگر انجلی کی خوبصورتی اور قد وقامت کی آب وتاب کو دیکھ کر نہ جانے کہاں سے اُس کے اندر شاعرانہ انداز آ گیا تھا۔ انجلی نے کچھ شرماتے اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا ''انکل، آپ بھی کیا بات کر رہے ہیں۔''

تھوڑی دیر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر موقع دیکھ کر کپور نے کہا ''یاد ہے ایک دن تم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر میں کبھی آپ کے کسی کام آ سکوں تو مجھے بھولیے گا نہیں۔''

''ہاں ہاں، مجھے یاد ہے۔'' انجلی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''تو آج میرا کام کر دو۔'' کپور نے بنا کسی جھجک کے کہا۔

''ایسا کون سا کام ہے؟'' انجلی نے حیرت سے پوچھا۔

اُس وقت کپور صوفے کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا اور انجلی سامنے کرسی پر بیٹھی تھی، کپور نے کہا ''میرے نزدیک آؤ بتاتا ہوں۔''

انجلی کرسی سے اُٹھ کر صوفے کے دوسرے کونے میں بیٹھ گئی۔ کپور نے کہا ''میرے پاس آ کر بیٹھو۔ بتاتا ہوں۔''

جب انجلی کپور کے ساتھ جا کر بیٹھی تو اُس نے انجلی کی کمر کو اپنے ہاتھ سے جکڑ لیا۔ انجلی گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی اور کہنے لگی ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے شرم نہیں آتی آپ کو؟ اگر میرا شوہر گھر پر ہوتا تو کیا آپ ایسی ہمت کرتے؟''

کپور نے حوصلے سے جواب دیا ''غصہ مت کرو انجلی، تمھیں اچھا نہیں لگتا تو نہ سہی۔ میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرتی ہو یا نہیں۔''

''میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا'' انجلی نے کرخت لہجے میں کہا۔

''مگر تم نے صاف بھی نہیں کہا تھا'' کپور نے واضح کرتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ تو بال کی کھال نکال رہے ہیں'' انجلی نے پھر بگڑ کر کہا۔ پھر بولی ''چھوڑیے اس بات کو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں نے سامنے والے کمرے میں آپ کا بستر لگا دیا ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔'' کیونکہ وہ اکیلی تھی اُسے کچھ ڈر محسوس ہوا۔ مگر وہ کپور کے ساتھ اور بے رُخی سے بھی پیش نہیں آنا چاہتی تھی کیونکہ اُس نے ہی ایک طرح سے اُس کی جان بچائی تھی۔ اس لیے وہ بات کو ٹال گئی۔ کپور نے اُس سے اور کچھ نہیں کہا۔ وہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے دروازے کو بلی لگا دی۔

کپور وہاں سے اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ کپڑے بدل کر بیٹھک میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور کتاب کھول کر پڑھنے لگا۔ اُسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد انجلی اپنے کمرے سے اُٹھ کر آئی اور کپور سے کہنے لگی ''آپ ابھی تک سوئے نہیں۔ کچھ چاہیے تو نہیں؟''

کپور نے مسکرا کر کہا ''جو چاہیے تھا وہ تو تم نے دیا نہیں؟''

انجلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چلی گئی مگر چار قدم جانے کے بعد وہ مڑی اور کپور سے کہنے لگی ''اب آپ سو جائیے۔ دیر ہو گئی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اپنے کمرے کے اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ دس منٹ بعد کپور کرسی سے اُٹھا اور انجلی کے دروازے کے پاس جا کر رُک گیا۔ اُس نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا۔ بلی نہیں لگی ہوئی تھی۔ تھوڑا اور دھکیلنے سے دروازہ کھل گیا۔ وہ چپکے سے اندر چلا گیا۔ انجلی جاگ رہی تھی۔ پلنگ پر لیٹی وہ کپور کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

OO

بھینس کا عاشق

متھرا شہر کے نواحی علاقے میں بھیروں نام کا ایک گوالا رہتا تھا۔ اُس کے پاس ایک چھوٹی سی حویلی تھی جس کے ایک کونے میں اینٹوں سے بنا دو کمرے کا مکان تھا جہاں وہ اپنی بیوی دیوکی اور دو بچّوں کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ دوسرے کونے میں وہ گائے بھینسوں کو کھونٹیوں سے باندھ کر رکھتا تھا۔ تیسرے کونے میں سردی اور برسات میں جانوروں کو محفوظ رکھنے کے لیے پھوس کا سائبان تھا اور چوتھے کونے میں چارہ وغیرہ رکھنے کے لیے چھوٹا سا گودام تھا۔ اُس کے پاس چار گائیں اور دو بھینسیں عموماً رہتی تھیں۔ وہ اُن کا دودھ بیچتا تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ ایماندار آدمی ہے یعنی نہ تو دودھ میں پانی ملاتا ہے اور نہ ہی کم ناپتا ہے۔ اُس کے دودھ کا بھاؤ بازار سے کچھ زیادہ تھا لیکن اُس کے بہت سے گاہک بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اُس کا سارا دودھ بک جاتا تھا۔

کئی سالوں سے وہ گائے بھینس حصار کے پشو میلہ سے خرید کر لاتا تھا۔ تجربے سے اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہریانہ کے گھریلو جانور تندرست ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دودھ صحیح مقدار میں دیتے ہیں۔ دو سال میں اُس کا ایک چکّر تو لگ ہی جاتا تھا کیونکہ کوئی نہ کوئی جانور دودھ دینا بند کر دیتا تھا یا مر جاتا تھا۔ عموماً وہ اکیلا ہی ریل گاڑی سے حصار جاتا تھا اور واپس خریدے ہوئے جانور کو ساتھ لے کر کوئی ایک سو ستّر میل کا سفر پیدل چل کر کرتا تھا چاہے اُسے راستے میں تین چار دن لگ جائیں۔ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کا چھوٹا بھائی

موہن جانوروں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ دودھ دیو کی نکالتی تھی اور گاہکوں سے بھی وہی نپٹتی تھی۔ کیونکہ بچّے ابھی چھوٹے تھے، وہ اپنی ماں کا ہاتھ بٹانے سے قاصر تھے۔ دونوں میاں بیوی کرشن مراری کے بھگت تھے جس کی ایک بڑی سی مورتی انھوں نے گھر میں رکھی ہوئی تھی۔ ہر صبح شام بلاناغہ وہ اُس مورتی کے آگے بیٹھ کر پوجا کرتے تھے۔ اُنھیں اپنے بھگوان پر پورا اعتماد تھا۔

حصار میلے میں بھیروں گائے بھینس بنواری نام کے گماشتہ کی معرفت لیتا تھا۔ بنواری نے دو چار سودے ایسے کروائے تھے جو کسوٹی پر کھرے اُترے تھے۔ اس لیے اسے بنواری پر پورا بھروسہ تھا۔ مگر اُس کی ایک شرط تھی کہ سودا ہونے کے بعد وہ اگلی صبح گائے یا بھینس کا دودھ اپنے سامنے نکلوائے گا تا کہ اُس کی تسلی ہو جائے کہ واقعی وہ اتنا ہی دودھ دیتی ہے جتنا بیچنے والے نے دعویٰ کیا تھا۔ ویسے بھی اپنے پیشہ میں اُسے کافی تجربہ تھا۔ وہ گائے یا بھینس کو دیکھ کر بتا دیتا تھا کہ یہ کس نسل کی ہے، کتنی عمر ہے، کوئی بیماری تو نہیں۔ چاہے اُسے حصار میں دو تین رات کیوں نہ گزارنی پڑے وہ ہر طرح احتیاط سے جانور کا انتخاب کرتا تھا۔

اکتوبر کے مہینے میں جب میلہ لگا وہ ایک بھینس خریدنے کے لیے وہاں پہنچا اور بنواری سے فوراً رابطہ قائم کیا۔ بنواری نے اُسے چار بھینسیں دکھائیں مگر بھیروں کو کوئی بھی پسند نہیں آئی۔ دونوں میلے میں گھوم رہے تھے کہ اچانک اُن کی نظر ایک بھینس پر پڑی جو ہٹّی کٹّی، تندرست اور چھوٹی عمر کی لگتی تھی۔ بھیروں نے بنواری کو اُس کے مالک سے بات کرنے کو کہا۔ بازار کے بھاؤ سے اُس بھینس کی قیمت دو ہزار سے کم نہیں ہونی چاہیے تھی مگر مالک نے جب صرف ڈیڑھ ہزار کی مانگ کی تو دونوں کو تعجّب ہوا اور شک بھی۔ بنواری نے اُس شخص کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب اُس نے پوچھ تاچھ کی تو اس شخص نے بتایا کہ وہ نزدیک کے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ وہ پیشہ سے جانوروں کا تاجر نہیں ہے بلکہ ایک کسان ہے۔ اُس کے پاس صرف یہی ایک بھینس ہے، جس کے دودھ کا استعمال وہ گھر کے لیے کرتا ہے، لیکن اُسے پیسے کی سخت ضرورت پڑ گئی ہے کیونکہ اسے اپنی لڑکی کا بیاہ کرنا ہے۔ گاؤں میں اُس نے

اپنی بھینس کو بیچنے کی کوشش کی مگر کوئی خریدار نہیں ملا جو اُس کو نقد دام دیتا۔ اُس کے ایک دوست نے صلاح دی کہ بھینس کو پشو میلے میں لے جاؤ وہاں نقدی میں بک جائے گی۔ بھینس کی کتنی قیمت ہونی چاہیے مجھے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ میں نے تو وہی قیمت بتائی ہے جو مجھے گاؤں میں مل سکتی تھی۔ باقی جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں جانور میں کوئی نقص نہیں ہے۔ مجبوری کی وجہ سے بیچ رہا ہوں ورنہ میری ایسی کوئی خواہش نہیں تھی۔ بنواری اور بھیروں کو اس کی تشریح صحیح لگی۔ بنا حیل وحجت اور سودے بازی کے بھیروں بھینس خریدنے کے لیے مان گیا، مگر اُس نے اگلی صبح بھینس کا دودھ اپنے سامنے نکلوانے کی شرط رکھی جس کو بھینس کا مالک جھٹ سے مان گیا۔

اگلی صبح جب بھینس کا دودھ نکالا گیا تو اتنا ہی نکلا جتنا بھینس کے مالک نے دعویٰ کیا تھا۔ بھیروں نے بھینس کے دام چکائے۔ بنواری کو تین سو روپے کمیشن کے دیے اور اُسی وقت وہ بھینس اور اُس کے بچھڑے کو ساتھ لے کر حصار سے پیدل چل پڑا۔ راستے میں آرام کرنے اور کھانے پینے کے لیے وہ کئی جگہ رُکا۔ بھینس کا دودھ نکال کر وہ راستے میں بیچ دیتا جس سے بھینس کے چارے کے دام وصول ہو جاتے اور اُس کا اپنا کھانا پینا بھی بڑے آرام سے ہو جاتا۔ بھینس ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک بالکل کالی تھی۔ صرف ماتھے پر بندی کی طرح ایک سفید سا تل تھا جو اس کی سب سے بڑی شناخت تھی۔ بھینس سیدھی سادی تھی جسے لے جانے میں بھیروں کو کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ کبھی کبھی کوئی جانور ایسا مل جاتا ہے جو بڑا اڑیل ہوتا ہے۔ ایسے جانور کو قابو میں کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ وہ خوش تھا کہ نہ صرف اُسے کم دام میں ایک اچھی بھینس مل گئی اُس کے ساتھ ساتھ وہ دودھ بھی صحیح مقدار میں دیتی ہے۔ اُس کے علاوہ وہ تنگ بھی نہیں کرتی تھی۔ ایسا کھرا مال اُسے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔

تین دِن کے لمبے سفر کے بعد وہ شام کے کوئی پانچ بجے گھر پہنچا۔ اُس کا بھائی اور بھابھی دیو کی اس کی راہ دیکھ رہے تھے۔ جب اُن کی نظر بھینس پر پڑی تو دونوں کے منہ سے

ایک ساتھ یہ الفاظ نکلے "لگتا ہے اس بار آپ کو بڑھیا مال مل گیا ہے۔"

موہن نے فخر سے کہا "بھیا، کیا بھینس ہے! ایسے ڈیل ڈول والی اور صحت مند بھینس ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ کسی اچھی نسل کی لگتی ہے۔"

جب بھیروں نے اُس کے دام بتائے تو موہن بھونچکّا رہ گیا۔ کہنے لگا۔ "بھیا اس بار تو آپ نے اچھّا ہاتھ مارا ہے۔ مجھے تو ابھی بھی یقین نہیں آتا۔"

جب بھیروں بھینس کو چوکھٹ سے اندر لانے لگا تو دیوکی نے کہا۔ "ٹھہرو، ابھی اسے اندر مت لانا۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ گھر کے اندر گئی اور تھالی میں پوجا کا سامان لے کر آئی۔ سب نے مل کر بھینس کی آرتی اُتاری۔ دیوکی نے بھینس کے ماتھے پر چندن کا لمبا سا ٹیکا لگایا ار اُس کے گلے میں لال رنگ کے پھولوں کا ہار ڈالا پھر کہا "اب اسے اندر لے آؤ۔"

صبح جب کوئی پانچ بجے بھیروں نے بھینس کا دُودھ نکالا وہ صحیح تھا۔ سب بڑے خوش تھے۔ انھوں نے اُس کا نام کالی رکھا۔ مگر پانچویں دن جب بھیروں نے دودھ نکالنے کے لیے بچھڑے کو چھوڑا تو کالی نے اُسے پاس نہیں آنے دیا۔ جب بچھڑے نے دوبارہ کوشش کی تو کالی نے اُسے اپنے سینگوں سے ڈرا کر بھگا دیا۔ بھیروں کو تعجّب ہوا۔ اُس نے سمجھا شاید کوئی جسمانی تکلیف ہے۔ اُسے غور سے دیکھا۔ اُس کے جسم کی چاروں طرف سے جانچ پڑتال کی مگر ایسی کوئی علامت دِکھائی نہیں دی جس سے وہ بیمار لگے۔ آخر کالی کو کیا ہو گیا تھا؟ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ بڑی مشکل سے اُس نے بھینس کو قابو میں کیا اور بچھڑے کو پھر چھوڑ دیا۔ بچھڑے نے جب تھن کو منھ میں ڈالا بھیروں کو لگا کہ اُس میں سے دودھ نہیں نکل رہا تھا۔ بھیروں کو گھبراہٹ ہوئی۔ اُس نے اپنے بھائی کو بلایا۔ دونوں مشورہ کر کے بھینس کو اُسی وقت پشو حکیم کے پاس لے گئے۔ بھینس کا معائنہ کرنے کے بعد حکیم نے کہا "مجھے اُس میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی۔ اُس نے صبح دودھ کیوں نہیں دیا میں ٹھیک طور سے نہیں کہہ سکتا۔ اگر یہ کل بھی دودھ نہ دے تو اسے پھر میرے پاس لے آنا۔"

اگلے دن بھی کالی نے ایک بوند دودھ نہیں دیا۔ اُس کے چہرے سے لگتا تھا وہ کچھ گھبرائی ہوئی ہے۔ بھیروں اُسے دوبارہ حکیم کے پاس لے گیا۔ حکیم نے بھینس کا ایک بار پھر معائنہ کیا اور کچھ دیر سوچ کر کہنے لگا ''مجھے لگتا ہے کوئی آدمی صبح سویرے اُس کا دودھ چوری سے نکال کر لے جاتا ہے۔ تم نظر رکھو۔''

بھیروں کو حکیم کی بات جچ گئی۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا مگر ایسا ہونا ناممکن نہیں تھا۔ تیسرے دن بھیروں چار بجے اُٹھا، ایک کالا کمبل اوڑھا اور ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا لے کر سائبان کے اوٹ میں بیٹھ گیا۔ جوں ہی چور آئے گا وہ اُس پر جھٹ سے وار کر دے گا۔

بھیروں کے گھر کے آگے کوئی سو گز کی دُوری پر پیپل کا ایک بہت بڑا گھنا پیڑ تھا۔ کوئی بیس پچیس منٹ کے بعد اُسے پتّوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ چور پتّوں میں چھپا ہوا تھا اور اب وہ پیڑ سے نیچے اُتر رہا ہے۔ وہ چوکنا ہو گیا اور ڈنڈے کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا تاکہ موقع ملتے ہی وہ چور پر وار کر دے۔ دو منٹ کے بعد وہ دہشت سے کانپنے لگا، جب اُس نے ایک کالے ناگ کو پیڑ سے نیچے اُترتے ہوئے دیکھا۔ پیڑ سے اُتر کر ناگ سیدھا حویلی کی طرف بڑھا۔ دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ایک چھوٹے سے پیڑ کا سہارا لے کر ناگ حویلی کے اندر آیا اور کالی کی طرف لپکا۔ بھیروں خوف سے ایسے دب گیا جیسے وہ منجمد ہو گیا ہو۔

ناگ کو دیکھ کر کالی تھر تھر کانپنے لگی، کیونکہ وہ کھونٹی سے بندھی ہوئی تھی نہ تو وہ بھاگ سکتی تھی اور نہ ہی سینگوں کا استعمال کر کے اپنا بچاؤ کر سکتی تھی۔ چھوٹے سے سائبان کے اندر اس کی حرکت پذیری صفر کے برابر تھی۔ کالی کے نزدیک آتے ہی ناگ نے اس کی پچھلی ٹانگوں کو اپنی دُم سے جکڑ لیا جیسے گوالا دودھ نکالنے سے پہلے انھیں رسّی سے باندھ دیتا ہے تاکہ وہ ٹانگ نہ مارے۔ ناگ نے ایک ایک کر کے چاروں تھنوں سے دودھ پی لیا اور جس راستے سے آیا تھا اُسی سے واپس چلا گیا۔ اُس کا پیٹ اتنا بھر گیا تھا کہ وہ پتّوں میں چھپ کر سو گیا۔ اتنے میں سورج کی پہلی شعاع دِکھائی دی۔ بھیروں کو یقین نہیں آیا۔ وہ بھی گھبرایا ہوا تھا،

جس کی وجہ سے بولتے وقت اُس کی زبان لڑکھڑاتی تھی۔ جب دیوکی نے سارا قصہ سنا وہ بھی خوف سے کانپنے لگی۔ وہ مورتی کے آگے کھڑی ہو کر کہنے لگی "ہے بھگوان، یہ آپ نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟"

بھیروں نے جب اپنے بھائی کو ناگ کا قصہ سنایا تو وہ بھی چونک پڑا۔ اس پیچیدہ مسئلہ کا کیا حل نکالا جائے یہ اُن کے لیے کسی دعوتِ مبارزت سے کم نہیں تھا۔ وہ تیسرے آدمی سے مشورہ نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں ڈر تھا اگر بات پھیل گئی تو لوگ دودھ لینا بند کر دیں گے۔ بھیروں کا سارا دھندا چوپٹ ہو جائے گا۔ وہ حکیم کو بھی بتانے سے گھبراتے تھے۔ جب موہن نے کالی کو بیچنے کی صلاح دی تو دیوکی نے رنجیدہ آواز میں کہا "نہیں، ہم اسے فروخت نہیں کریں گے۔ اگر کسی نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بھی اُس طرح کا دھوکا کریں۔ یہ پاپ میں اپنے سر مول نہیں لینے دوں گی۔"

بھیروں نے دیوکی کی تائید کرتے ہوئے کہا "یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرا بھی دل نہیں کرتا کہ ہم اسے بیچ کر گناہگار بنیں۔"

"تو پھر کیا کریں گے آپ؟" موہن نے واجبی سوال کیا۔

"سوچنا پڑے گا۔" بھیروں نے اپنا سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا۔

موہن نے کہا "سوال صرف بھینس کا نہیں۔ اتنے بڑے ناگ سے ہم مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کسی دن غصہ میں وہ تمھیں ڈس بھی سکتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا یہ ناگ کہاں سے آیا؟" بھیروں نے کہا۔

"بھیا، سیدھی بات ہے۔ ناگ پہلے سے ہی کالی کا دودھ پیتا آ رہا ہے، اسی لیے اس کے مالک نے اسے کم دام پر بیچ کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اپنی قوتِ حس سے ناگ کالی کو ڈھونڈتا ڈھانڈتا یہاں پہنچ گیا۔" موہن نے کافی سوچ سمجھ کر صحیح جواب دیا۔

کافی غور و فکر کے بعد دونوں بھائی اور دیوکی اس نتیجے پر پہنچے کہ "کالی کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ وہ اپنے آپ ناگ سے نپٹے گی۔" کیونکہ وہ بھیروں کے لیے نہ صرف ایک

مصیبت تھی بلکہ خوف کی وجہ بھی تھی۔ اس کو زیادہ دیر گھر میں رکھنا عقل مندی کی بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اُسے چارہ بھی کھلانا پڑتا تھا۔ کبھی بھی کسی طرح کی افواہ بھی پھیل سکتی ہے جس سے اُسے اور بھی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ پہلے ہی دو چار گاہکوں نے اس سے سوال کیا ہے کہ کالی اتنی تندرست ہے اور ہٹی کٹی ہے مگر دودھ کیوں نہیں دے رہی۔ اُس نے ان کو یہ جواب دے کر کہ وہ کچھ بیمار ہے، ٹال دیا۔ مگر وہ ایسا کب تک کر سکتا تھا۔ بھیروں نے کہا "میں اسے کل ہی چھوڑ آؤں گا۔"

جو جنگل سب سے نزدیک تھا وہ بھی کوئی بیس میل دُور تھا۔ کوئی دو بجے دوپہر وہ بھینس اور بچھڑے کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف نکل گیا۔ ابھی اس نے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ جب بارش رُکی تو شام کے پانچ بج گئے تھے۔ بارش ہونے کی وجہ سے راستے میں کئی جگہوں پر پانی بھر گیا تھا اور کیچڑ بھی تھا۔ کرتے کراتے جب وہ جنگل پہنچا رات کے نو بج چکے تھے۔ خوش قسمتی سے چاندرات نے اُس کی رہبری کی۔۔ وہ راستے سے ہٹا نہیں۔ جب وہ کالی کی گردن سے رسّی کھولنے لگا تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اُس کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ اپنے دل پر قابو پا کر اُس نے رسّی کھول دی اور اُسے جنگل میں چھوڑ دیا۔ کالی وہاں سے بھاگی نہیں بلکہ وہ بھیروں کے منہ کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو اس میں میرا کیا قصور ہے؟' اپنا دل کڑا کر کے بھیروں مڑا اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

ابھی بھیروں کچھ قدم ہی آگے گیا تھا کہ اُس نے کالے ناگ کو تیزی سے اُسی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ گھبرا کر جلدی سے ایک پیڑ کے اوپر چڑھ گیا۔ اُسے پتہ تھا کہ ناگ بھی پیڑ پر چڑھ سکتا ہے، مگر بھیروں جانتا تھا کہ ناگ اُس کا نہیں بلکہ کالی کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں آیا ہے۔ اب وہ یہ دیکھنے کا مشتاق تھا کہ جب کالی اور ناگ کا آمنا سامنا ہوگا تو کیا گل کھلے گا۔ ناگ کو دیکھتے ہی کالی چوکنّی ہو گئی۔ اب اُس میں وہ گھبراہٹ یا خوف نہیں تھا جو بھیروں نے سائبان میں دیکھا تھا۔ اب اُس کی آنکھوں میں ویسا ہی خون اُتر رہا تھا جو ناگ کی آنکھوں میں۔ اُس نے بھی ناگ کو ایسے للکارا جیسے ناگ نے اُسے۔ اُس نے بھی اتنے ہی

زور سے دہاڑ ماری جیسے ناگ نے پھنکار۔

کالی میں اتنا جوش وخروش دیکھ کر ناگ اُس کے سامنے آ کر رُک گیا۔ اُس نے اپنا سر اُٹھا کر ہلکی سی پھنکار ماری جیسے وہ اُس سے کہہ رہا ہو' جانِ من، مجھ سے پیچھا چھڑا کر تم کہاں جاؤ گی۔ میں تمھارا سچا عاشق ہوں۔ مرجاؤں گا مگر تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔'

کالی نے اپنی گردن اُوپر اُٹھائی اور جھنجھلا کر اپنی آنکھوں کی لو سے مبارزت طلبی کی 'آؤ، آگے آؤ۔ دیکھتی ہوں اب تم میرا دودھ کیسے پیتے ہو۔ اب میں آزاد ہوں۔ کھونٹی سے بندھی ہوئی نہیں ہوں اور نہ ہی میری حرکت سائبان کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اب میں کھلے میدان میں ہوں۔ ہو جائیں دو دو ہاتھ۔ آج تک تم نے میری مجبوری اور بے بسی کا ناجائز فائدہ اُٹھایا ہے۔ تم نے میرا دودھ پی کر میرے بچّے کو ماں کے دودھ سے محروم رکھا ہے۔ جتنا دودھ تمھیں پینا تھا پی لیا۔ اب اور نہیں پی پاؤ گے۔'

ناگ غصّے سے تلملا اُٹھا کیونکہ کالی نے اُسے للکارا تھا۔ اُس نے آگے سے وار کرنے کی بجائے کالی کی ٹانگوں کو اپنی دُم سے پکڑنے کی کوشش کی، مگر کالی نے اُسے ایسی ٹانگ ماری کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ بار بار کوشش کرتا رہا اور کالی اُس کی ہر کوشش کو ناکام کرتی رہی۔ اُس کی اُمیدوں پر پانی پھیرتی رہی۔ اُن کا مقابلہ کسی گھمسان لڑائی سے کم نہیں تھا۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک چلتا رہا اور بھیروں پیڑ پر بیٹھا تماشہ دیکھتا رہا۔ ناگ نے سوچا یہ ایسے قابو میں نہیں آئے گی۔ اُس نے نئی چال چلی۔ اب وہ بھینس کے آگے گیا اور اس کی گردن کو اپنی دُم سے لپیٹنے کے ارادے سے اُس پر وار کیا۔ مگر کالی نے اپنے لمبے نوک دار سینگوں سے اُس کی کوشش ناکام کر دی۔ ناگ نے پھر وار کیا۔ ناگ وار کرتا رہا اور کالی اپنا بچاؤ کرنے میں ہر بار کامیاب رہی۔ ایک وار میں کالی کو اپنے سینگ سے ناگ کے سر پر ضرب لگانے کا موقع مل گیا۔ اُس کا نشانہ صحیح بیٹھا۔ ناگ کے سر پر گہری چوٹ لگی اور وہ دہشت سے پیچھے ہٹ گیا۔

بار بار کی ناکامی نے ناگ کو پاگل کر دیا۔ جس بھینس کو وہ اپنی معشوق سمجھتا تھا اب وہ

اس کا دشمن بن گیا۔ اُس نے طیش میں آ کر کالی کو ڈسنے کا ارادہ کیا۔ موقع ملتے ہی اُس نے کالی کے پیٹ میں ڈس لیا۔ کالی اس وار کے لیے تیار نہیں تھی۔ ناگ کے ڈستے ہی وہ گر پڑی اور چند لمحوں میں زہر اُس کے سارے جسم میں پھیل گیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ ہمیشہ کے لیے ڈھیر ہو گئی۔ ناگ نے جب کالی کے دھڑ کو دیکھا وہ اپنی جیت پر اِترایا نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اتنی دیر لڑائی کرتے کرتے وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔ سر میں اتنی زبردست چوٹ لگی تھی مگر بھیانک مڈ بھیڑ کی تند خوئی میں اُس کو درد کا احساس نہیں ہوا۔ اب جبکہ وہ لڑائی ختم ہو چکی تھی وہ درد ایک انتقام کی طرح اس کے سر پر سوار ہو گیا تھا۔

ناگ درد سے چلاّنے لگا۔ وہ اسے برداشت نہیں کر پایا۔ کبھی اپنے سر کو زمین پر مارتا تو کبھی اُسے لٹو کی طرح گھماتا۔ اُس کی سانس بھی رُک رُک کر آنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ آخر وہ ہار گیا۔ اپنے سر کو کالی کی پیٹھ پر رکھ دیا اور دَم توڑ دیا۔ بھیروں نے جب ان دونوں کو بے حس و حرکت دیکھا وہ پیڑ سے نیچے اُترا اور یہ تصدیق کرنے کے لیے کہ واقعی ہی وہ دونوں مر چکے تھے وہ آہستہ آہستہ اُن کے نزدیک گیا۔ اتنے میں رات کے کوئی چار بج گئے تھے۔ وہ ان دونوں پر آخری نظر ڈال کر واپس اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ کچھ قدم جانے کے بعد اُسے بچھڑے کا خیال آیا، جو اپنی ماں کے مردہ جسم کے پاس کھڑا آنسو بہار ہا تھا اور چلاّ رہا تھا۔ بھیروں کو اُس کی حالت پر رحم آ گیا اور اُسے ساتھ لے کر گھر آ گیا۔ جب تک بھیروں زندہ رہا وہ اس عجیب و غریب واقعے کو کبھی نہیں بھلا سکا۔

OO

"... تمھارے سرکردہ کا یہ سوچنا
کہ ساری دُنیا پر مسلمانوں کی
حکومت ہو جائے گی وہ بھی بے بنیاد
ہے۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ ایک
منٹ کے لیے مان لو ایسا ہو بھی گیا تو
تمھارا کیا خیال ہے، مسلمان ایک
دوسرے کا گلا کاٹنا چھوڑ دیں گے؟
کیا امیر مسلمان اپنی پونجی غریب
مسلمانوں میں بانٹ دیں گے؟ کیا
مسلمان حکمراں رشوت لینا بند کر دیں
گے؟ کیا چور بازاری، غنڈہ گردی،
زنا بالجبر، دھوکا دھڑی ختم ہو جائیں
گے؟"

(افسانہ "بیرنگ لفافہ" سے)
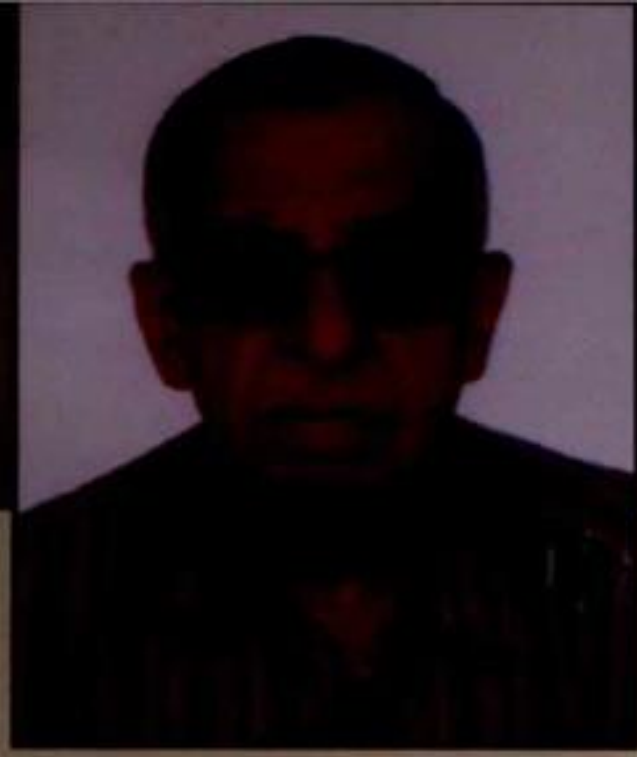
کشوری لال کی ولادت مظفر گڑھ میں ہوئی جواب پاکستان کا حصہ ہے۔ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۷ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے M.A. (انگریزی) اور دہلی یونی ورسٹی سے L.L.B. کیا۔ ۱۹۵۶ سے لے کر ۱۹۸۱ وزارتِ خارجہ میں کام کرنے کے بعد انھوں نے اپنی رضا سے ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی۔وزارتِ خارجہ میں تقرری کے دنوں میں بنگلا دیش، برما، پاکستان، انڈونیشیا، جاپان اور امریکہ کے اسفار کیے۔اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی شاعری کرتے ہیں اور افسانے بھی لکھتے ہیں۔ان زبانوں میں ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ چوں کہ ان کو دوسرے ممالک میں کافی عرصے تک رہنے اور مختلف پیشے اور طبقے کے لوگوں سے ملنے کا تجربہ ہے اس لئے ان کی تخلیقات میں تنوع پایا جاتا ہے،اور اسلوب میں مزاح، ہجواور سوز وگداز کا اہم مقام ہے۔